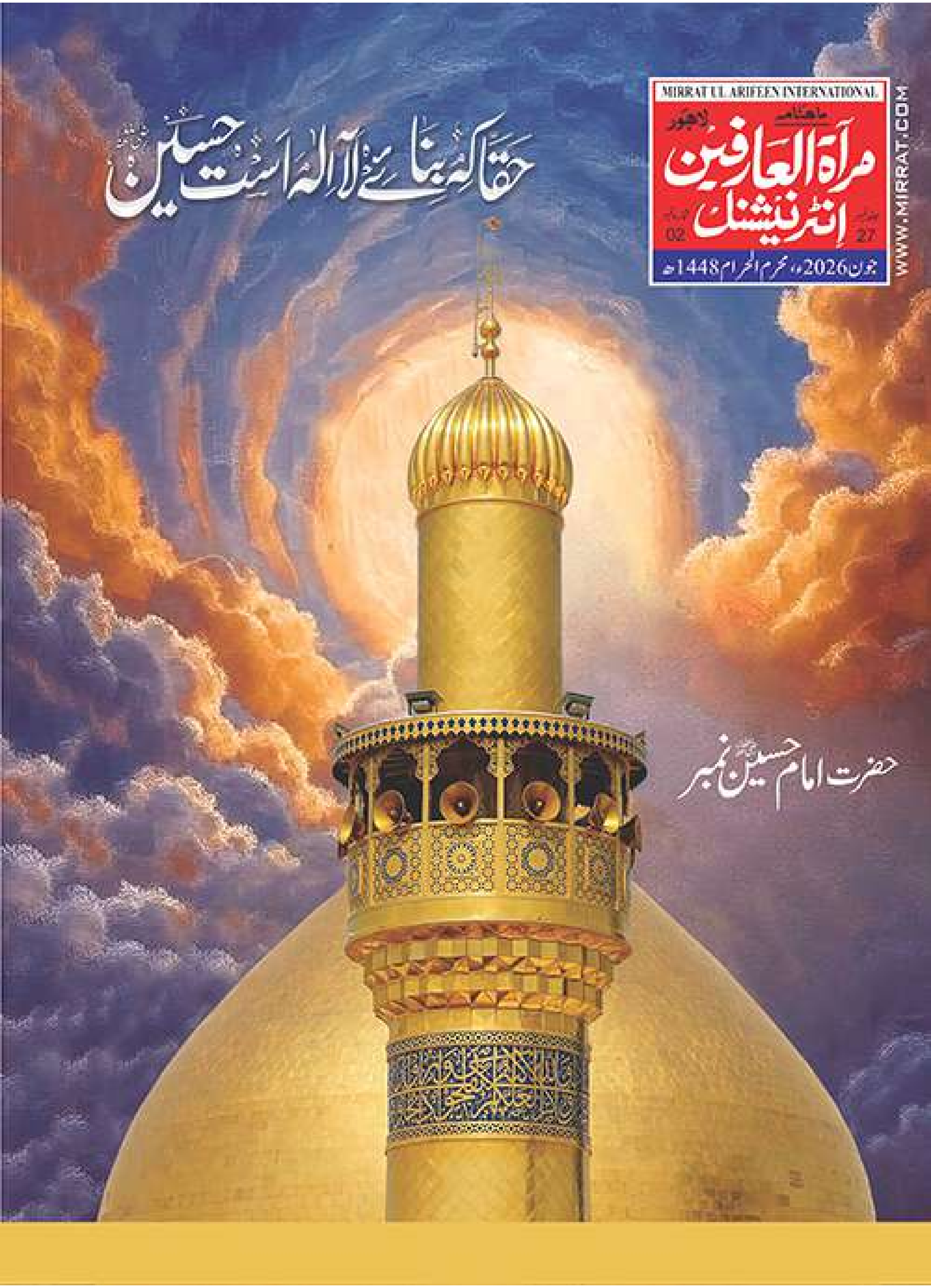
MIRRAT UL ARIFEEN INTERNATIONAL
ماہنامہ
مرآۃ العارفین انٹرنیشنل
لاہور
27
02
جون 2026ء، محرم الحرام 1448ھ
WWW.MIRRAT.COM
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ
حضرت امام حسینؑ نمبر

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمائیے! کہ میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا سوائے قرابت (اہل بیت) کی محبت کے۔ (الشوریٰ: 23)

سیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي مَثَلُ سَفِينَةِ نُوحٍ، مَنْ رَكِبَهَا نَجَا، وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ مَثَلُ بَابِ حِطَّةٍ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ مَنْ دَخَلَ غُفِرَ لَهُ

میرے اہل بیت کی مثال سفینہ نوح کی طرح ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا اور جو پیچھے رہا وہ غرق ہوا۔ بے شک میرے اہل بیت کی مثال تم میں بنی اسرائیل میں باب حطہ کی طرح ہے جو اس میں داخل ہوا اس کی بخشش کر دی گئی۔ (رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر)

پَنجے مَحل پَنجاں وِچ چَانن ڈِیوا کِت وَل دھریئے ھو
پَنجے مہر پَنجے پٹواری حاصِل کِت وَل بھریئے ھو
پَنجے اِمام تے پَنجے قِبلے سَجدہ کِت وَل کریئے ھو
باھوؒ جے صَاحب سر منگے ہرگز ڈِھل نہ کریئے ھو

(ابیات باھوؒ)

مسلسل اشاعت کا ستائیسواں سال

MIRRAT UL ARIFEEN INTERNATIONAL

ماهنامہ

مرآۃ العارفین انٹرنیشنل

لاہور

جون 2026ء، محرم الحرام 1448ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فیضانِ نظر

سُلطان الفقر حضرت سخی سُلطان محمد اصغر علی صاحب قدس سرہ العزیز

چیف ایڈیٹر: صاحبزادہ سلطان احمد علی

ایڈیٹوریل بورڈ:
- سید عزیز اللہ شاہ ایڈووکیٹ
- مفتی محمد شیر القادری
- افضل عباس خان

آرٹ ایڈیٹر:
- محمد احمد رضا
- واصف علی

نِکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبّیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اقبال)

سلطان العارفین حضرت سلطان باھو کی نسبت سے شائع ہونے والا فلسفۂ وحدانیت کا ترجمان،
اصلاحِ انسانیت کا پیمبر، اتحادِ ملّتِ بیضا کے لئے کوشاں، نظریۂ پاکستان کی روشنی میں استحکامِ پاکستان کا داعی

اس شمارے میں

1	اقتباس		3
	اداریہ		
2	دستک		4
	حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) نمبر		
	دینی تناظر:		
3	واقعہ کربلا: چشم کشاء حقائق	صاحبزادہ سلطان احمد علی	6
4	فکرِ حسین (رضی اللہ عنہ) کی ترویج میں صوفیائے کرام کا کردار	ڈاکٹر لئیق احمد	21
	جدید تناظرات:		
5	حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور عصرِ حاضر کے سماجی و اخلاقی بحران	ڈاکٹر عبد الباسط	29
6	ہیرو ازم کا جدید تصور اور اسوہ سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ)	بابر جان خوازی خیل	32
7	خوف، دباؤ اور استقامت: واقعہ کربلا کا نفسیاتی مطالعہ	وسیم فارابی	40
8	کربلا: ضبطِ نفس، قوتِ ارادہ اور آزادی کا بحرِ ہِمَم	محمد ذیشان دانش	45
	ہدیہءِ سُخن:		
9	کلام	نظیری نیشاپوری	48
10	نذرانۂ عقیدت در بارگاہِ سید الشہداء امام حسین (رضی اللہ عنہ)	مستحسن رضا جامی	49

فی شمارہ نیوز پیپر	فی شمارہ آرٹ پیپر
80 روپے	110 روپے
سالانہ (ممبرشپ) 960 روپے	سالانہ (ممبرشپ) 1320 روپے

سعودی ریال	امریکی ڈالر	یورپین پونڈ
800	400	280

اپنی بہترین اور مؤثر کاروباری تشہیر کیلئے مرآۃ العارفین میں اشتہار دیجئے رابطہ کیلئے: 0300-1275009

پبلشر سجاد علی چوہدری نے قاسم نعیم آرٹ پریس، بندر روڈ، لاہور سے چھپوا کر HST-1/8-A تسمنٹ، کینال سٹی، کینال بنک روڈ لاہور سے شائع کیا

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا" (الاحزاب:33)

"اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے گھر والو! اللہ صرف یہ ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھے اور تم کو خوب ستھرا پاکیزہ رکھے"۔

"حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) اللہ تعالیٰ کے فرمان "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارک پانچ تن پاک "حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، حضرت علی المرتضیٰ، سیّدہ فاطمہ الزہراء اور حسنین کریمین (رضی اللہ عنہم) کے حق میں نازل ہوئی"۔

(المعجم الأوسط للطبرانی، باب الحآء، من اسمه الحسن)

سرِّ جانی محبوبِ سبحانی غوث الاعظم محی الدین

سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی (رضی اللہ عنہ)

فرمان

"بے شک اللہ تعالیٰ جو اپنے مخلص بندوں کے حالات سے باخبر ہے وہ ان مواعظ و تذکرات بلیغہ اور عجیب و بدیع تنبیہات سے چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور فرما دے یعنی عقلاً اور شرعاً جو گندگی قبیح ہوتی ہے اسے ایک ہی مرتبہ، ایک ہی لمحہ میں دُور فرما دے- اے اہل بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) جو کرامت اور نجابت کی فطرت پر پیدا کیے گئے ہو تمہیں طبیعت کی میل، ہیولی کی گندگیوں سے پاک فرما دے جو جبلی ذاتی صفائی کے لیے رکاوٹ بنتی ہیں ایسا پاک کرنا جو اپنی حد کو پہنچا ہوا ہو اس طرح کے تم میں نقص کا شائبہ باقی نہ رہنے پائے اور عیب کا اصلاً رنگ نہ رہے"۔

(تفسیر جیلانی)

سلطان العارفین

حضرت سلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ)

فرمان

پنجے محل پنجاں وِچ چانن ڈیوا کت وَل دھریئے ھو
پنجے مہر پنجے پٹواری حاصل کت وَل بھریئے ھو
پنجے امام تے پنجے قبلے سجدہ کت وَل کریئے ھو
باھو جے صاحب سر منگے ہرگز ڈھل نہ کریئے ھو

(ابیاتِ باھُو)

فرمانِ قائدِ اعظم محمد علی جناح (رحمۃ اللہ علیہ)

ایمان، اتحاد، تنظیم

"اپنا حوصلہ بلند رکھیے- موت سے نہ ڈریئے، ہمارا مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ موت کا استقبال کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے، ہمیں پاکستان اور اسلام کا وقار بچانے کیلئے اس (موت) کا مردانہ وار سامنا کرنا چاہیے، صحیح مقصد کے حصول کی خاطر ایک مسلمان کیلئے جامِ شہادت نوش کرنے سے بہتر اور کوئی راہ نجات نہیں"۔

(پنجاب یونیورسٹی اسٹیڈیم میں عوام سے خطاب- لاہور، 30 اکتوبر، 1947ء)

فرمانِ علامہ محمّد اقبال (رحمۃ اللہ علیہ)

آن امام عاشقان پور بتول
سرو آزادی ز بستان رسول
در میان امت ان کیوان جناب
ہمچو حرف قل ہو اللّٰہ در کتاب

(رموز بیخودی)

شہیدِ کربلا کا نظریہ: "اَقدار، اِقتدار سے مقدم ہیں"

کربلا کے عظیم سانحے کو محض "دو شہزادوں کی سیاسی جنگ" قرار دینا تاریخ کی بدترین فکری بد دیانتی اور سطحی سوچ کا نتیجہ ہے- اگر ہم اس واقعہ کو اخلاقی عدسے سے دیکھیں، تو یہ اقتدار کی نہیں بلکہ اقدار کی جنگ تھی- سچ اور جھوٹ، یا عدل اور ظلم کے درمیان کوئی درمیانی راستہ (Grey Area) نہیں ہوتا، کچھ افعال اپنے جوہر میں ہی باطل ہوتے ہیں- سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا انکار کسی ذاتی انا یا سیاسی مفاد پر مبنی نہیں تھا، بلکہ اس قطعی اور اٹل سچائی پر استوار تھا کہ ایک فاسق و فاجر اور ملوکیت پسند نظام کو تسلیم کرنا بذاتِ خود ایک عظیم اخلاقی جرم ہے- یہ وہ مقام تھا جہاں صوفیائے کرام کے بقول، مصلحت اندیش عقل نے عشقِ الٰہی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے- امام عالی مقام کا یہ قدم اس بات کا اعلان تھا کہ جب حق اور باطل کا ٹکراؤ ہو، تو حق کو تخت کی نہیں، بلکہ سچائی کی بقا کی فکر ہوتی ہے- لہٰذا یہ کسی تخت کے حصول کے لیے دو شہزادوں کا تصادم نہیں تھا، بلکہ ایک ابدی اور مطلق سچائی کا ایک عارضی اور کھوکھلے باطل کے خلاف اعلانِ جنگ تھا-

اصل قیادت وہ نہیں جو صرف حکومت حاصل کر لے، بلکہ وہ ہے جو طاقت کو اخلاق کے تابع رکھے- یزیدی تصورِ قیادت میں اقتدار اصل تھا اور اخلاق اس کے تابع جبکہ حسینی تصورِ قیادت میں اخلاق اصل تھا اور اقتدار اس کے تابع- یہی وجہ ہے کہ کربلا دو شہزادوں کی جنگ نہیں، دو اخلاقی نظریات کا تصادم تھی- ایک نظریہ کہ طاقت مل جائے تو اطاعت لازم کر دی جائے، دوسرا نظریہ کہ طاقت اگر عدل، دیانت، شریعت اور انسانی حرمت سے خالی ہو جائے تو اس کے سامنے کلمۂ حق کہنا دین کی امانت ہے- اہلِ سنت کے مسلمہ مزاج میں حضرت امام حسینؓ مظلوم، برحق، سید الشہداء اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محبوب نواسے ہیں، ان کے مقابل کھڑی قوت کو اخلاقی طور پر normalize کرنا نہ علمی دیانت ہے، نہ دینی ادب، نہ تاریخی انصاف- کربلا کا خلاصہ یہی ہے کہ فتح کبھی لشکر کی گنتی سے نہیں ہوتی، کبھی ایک مظلوم قافلہ پوری انسانیت کو یہ سکھا جاتا ہے کہ اصول پر مر جانا، اصول بیچ کر زندہ رہنے سے بلند تر ہے-

علم الاخلاق کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں کربلا کا معرکہ انسانی ضمیر کی بیداری کا سب سے طاقتور استعارہ ہے- ایک دنیاوی شہزادہ ہمیشہ زمین، وسائل اور اقتدار پر قبضے کے لیے فوج کشی کرتا ہے، لیکن امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا سفر قبضے کے لیے نہیں، بلکہ غاصبانہ اور غیر اخلاقی حکمرانی کے خلاف ایک اصولی اور پر امن مزاحمت تھی- آپؓ کا یہ تاریخی جملہ کہ "مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا" دراصل اس نظریے کی دلیل ہے کہ جب ریاست کا ڈھانچہ جبر، ظلم اور اخلاقی گراوٹ پر استوار ہو جائے، تو اس کے سامنے سینہ سپر ہونا ہر صاحبِ ایمان کا بنیادی فریضہ بن جاتا ہے- آپؓ کی اس مزاحمت نے دنیا کو سکھایا کہ ظالم کی طاقت کے سامنے خاموش رہنا ظلم کی خاموش تائید ہے اور سچی اخلاقی مزاحمت وہ ہے جو مادی نتائج کی پرواہ کیے بغیر صرف اس لیے کی جائے تا کہ انسانیت کا اخلاقی توازن اور دین کا اصل ڈھانچہ مسخ ہونے سے بچ جائے-

اگر کربلا کے اس عظیم معرکے کو علم الاخلاق کے جدید اور قدیم معیارات پر پرکھا جائے، تو یہ کھوکھلا دعویٰ یکسر زمین بوس ہو جاتا ہے کہ یہ تخت و تاج کی لڑائی تھی- ایک شہزادہ جب جنگ کے لیے نکلتا ہے تو اپنے ہمراہ جنگجو، اسلحہ اور لشکر لے کر جاتا ہے، جبکہ امام حسینؓ کے کارواں میں خواتین، معصوم بچے اور بوڑھے شامل تھے جو اس بات کا حتمی اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ آپ کا مقصد اقتدار چھیننا نہیں، بلکہ دینِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اصل روح کو اپنے خون سے سینچنا تھا- اصولی قیادت ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد اور جان کو نظریے پر قربان کرتی ہے جبکہ سیاسی اور ملوکیت پسند قیادت نظریے کو مفاد پر قربان کرتی ہے- سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنا سب کچھ لٹا کر یہ ثابت کر دیا کہ حقیقی قیادت وہ ہے جو اصولوں پر سودے بازی نہ کرے- کربلا کے میدان میں فتح یزید کے خیمے میں نہیں گئی، بلکہ امام حسینؓ کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ نیزے کی نوک پر مسکراتی رہی اور یہی وہ برحق نظریہ ہے جس نے ثابت کیا کہ یہ دو افراد کی نہیں بلکہ دو متصادم سوچوں کی جنگ تھی، جس میں ابدی بقا اور حقیقی فتح صرف حسینی نظریے کا مقدر بنی-

اگر موجودہ دور کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ آج کی دنیا بھی ایک نئے انداز کی یزیدیت کے نرغے میں ہے- فرق صرف اتنا ہے کہ ظلم و استبداد کی صورتیں بدل چکی ہیں- اب ظالم اپنا ظلم صرف تلوار اور لشکر کے ذریعے نہیں ڈھاتا بلکہ میڈیا، معیشت، سیاست، ثقافتی اور فکری یلغار کے ذریعے بھی انسان کے شعور پر قبضہ کرکے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے جسے ففتھ جنریشن وار فیئر کہا جاتا ہے- اس جنگ میں میڈیا خواہ وہ روایتی ہو یا سوشل، رائے سازی کا سب سے بڑا ہتھیار بن چکا ہے- کہیں اپنے خیالات کو ’’بیانیہ‘‘ بنا کر پیش کیا جارہا ہے تو کہیں جھوٹ کو ’’حکمتِ عملی‘‘ کا نام دیا جارہا ہے جبکہ انسانی اقدار کو مارکیٹ ویلیو کے مطابق ناپا جارہا ہے- ’’سائنس‘‘ میگزین میں شائع ہونے والے ایم آئی ٹی میڈیا لیب (MIT Media Lab) کے تجزیے کے مطابق، معلومات کی مختلف اقسام میں جھوٹی خبریں سچ کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ دور تک، تیزی سے اور بڑے پیمانے پر پھیلیں حتیٰ کہ خودکار اکاؤنٹس کو ہٹانے کے بعد بھی یہ رجحان برقرار رہا، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی رویہ ہی ان معلومات کو پھیلانے کا اصل محرک ہے-

فیک نیوز کے انسانی زندگی پہ بھی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں- عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق، ویکسینز نے گزشتہ 50 سالوں میں 15 کروڑ سے زائد انسانی جانیں بچائی ہیں، تاہم صرف 2024 میں 1 کروڑ 45 لاکھ شیر خوار بچے ضروری حفاظتی ٹیکوں سے محروم رہ گئے، جس کی ایک بڑی وجہ ویکسین کے بارے میں پھیلی غلط معلومات کو قرار دیا گیا ہے- یونیورسٹی آف بالٹیمور اور 'CHEQ' کی ایک تحقیق کے مطابق، غلط معلومات (ڈس انفارمیشن) سے عالمی معیشت کو سالانہ تقریباً 78 ارب ڈالر کا نقصان پہنچ رہا ہے، جس میں اسٹاک مارکیٹ میں ہونے والا 39 ارب ڈالر کا نقصان بھی شامل ہے- ایسے ماحول میں اسوۂ شبیریؓ محض مذہبی عقیدت کا استعارہ نہیں بلکہ حریتِ فکر، اخلاقی خودمختاری اور انسانی وقار کے تحفظ کے لیے زندہ منشور کی حیثیت رکھتا ہے-

پاکستان سمیت پوری اُمتِ مسلمہ آج جن شدید بحرانوں سے دوچار ہے وہ محض سیاسی یا معاشی نوعیت کے نہیں بلکہ بنیادی طور پر فکری، اخلاقی، تہذیبی اور ہمہ گیر بحران ہیں- فرقہ واریت، داخلی انتشار، بدعنوانی، ناانصافی، عدم برداشت، شدت پسندی، فکری و روحانی غلامی اور اجتماعی بے حسی نے اُمت کو کمزور کر دیا ہے- وفا نیوز ایجنسی کے مطابق، 7 اکتوبر 2023 سے غزہ کی پٹی پر جاری اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں شہید ہونے والوں کی تعداد 72,737 ہو چکی ہے، جبکہ اس تنازع میں اب تک کل 172,539 افراد زخمی ہوئے ہیں- 18 لاکھ سے زائد فلسطینی اپنے گھروں سے دربدر ہو چکے ہیں- غزہ میں بہت بڑا انسانی بحران ہے لیکن اسلامی دنیا محض خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے- مسلم دنیا وسائل رکھنے کے باوجود قیادت، اتحاد اور فکری خودمختاری سے محروم دکھائی دیتی ہے- اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسوۂ شبیریؓ کو عمل کی بجائے محض رسم و عقیدت تک محدود کر دیا ہے- اگر کوئی کردار آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے تو وہ سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی شخصیت ہے-

بطورِ مسلمان ہم پہ لازم ہے کہ اسوۂ شبیریؓ کو نہ صرف اپنے ذاتی بلکہ اجتماعی کردار، قومی و سماجی رویّوں اور عملی زندگی کا حصہ بنائیں- ہمیں اپنے معاشرے سے ظلم و استحصال، بدعنوانی، ناانصافی، فرقہ واریت، نفرت و شدت پسندی اور اخلاقی و روحانی انحطاط کی ان تمام صورتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا جو جدید یزیدیت کی شکل اختیار کر چکی ہیں-

بقول حکیم الاُمت علامہ محمد اقبالؒ:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوّت از حیات آید پدید

موسیٰؑ اور فرعون، شبیرؓ اور یزید یہ دو قوّتیں ہیں جو زندگی سے ظاہر ہوئیں- اِن میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ حق کے علمدار تھے- فرعون اور یزید نے باطل کی پاسداری کی- دونوں قوّتیں ابتداء سے چلی آتی ہیں اور اِن کے درمیان کشمکش بھی ہوتی رہی ہے-

واقعۂ کربلا: چشم کشاء حقائق

فکری خطاب: صاحبزادہ سُلطان احمد علی

سیکرٹری جنرل: اصلاحی جماعت و عالمی تنظیم العارفین

خانوادۂ سُلطان العارفین حضرت سُلطان باھُو قدس اللہ سرّہٗ

(میلادِ مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وعرس مبارک سید الشہداء امام حسین (رضی اللہ عنہ)، 5 جولائی، دربار حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) 2025ء)

واقعۂ کربلا ایک ایسا عظیم اور اندوہناک سانحہ ہے جو محض تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کی فکری اور عملی سمت کا تعین کرنے والا معیار ہے- یہی وہ کسوٹی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کون ظلم، غصب، دھاندلی، جبر، تشدد اور استبداد کے ساتھ کھڑا ہے اور کون عدل، حق، شرافت، اخلاق، کردار، علم اور حلم کی صف میں شامل ہے-

آج کا المیہ یہ ہے کہ سلف کا نام لیا جاتا ہے مگر خدمت ملوکیت کی ہوتی ہے، سلف صالحین کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر مقصد بادشاہتوں کے استحکام کو دوام بخشنا ہوتا ہے- ظاہری طور پر اسلامی اور علمی حلیہ اختیار کیا جاتا ہے، مگر عملاً ڈاکوؤں، غنڈوں اور قاتلوں کے دفاع میں دلائل فراہم کیے جاتے ہیں- علم کا نام لیا جاتا ہے، علماء کے القاب اپنائے جاتے ہیں، مگر حقیقت میں علم کی روح کو مسخ اور اس کی حرمت کو پامال کیا جاتا ہے-

علم اور علماء کی بدترین توہین یہی ہے کہ کوئی شخص خود کو عالم کہے مگر علم کے تقاضوں سے بیگانہ رہے- علم یہ سکھاتا ہے کہ حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا جائے، باطل کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہوا جائے، انصاف کو قائم رکھا جائے اور اخلاق و کردار کو زندگی کا جوہر بنایا جائے- عالم ہونے کا منصب در حقیقت حق کے ساتھ وابستگی کا نام ہے جبکہ علم کا حاصل عدل، اخلاق اور انسانی وقار کی پاسداری ہے-

آج اکابر و سلف صالحین کا نام لے کر جس استبداد، یزیدیت اور ظلم کی حمایت کی جاتی ہے، اس کے مقابل یہ امر واضح کرنا ناگزیر ہے کہ کربلا، اہلِ بیتِ اطہار اور حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آل کے بارے میں خود- اسلاف کا نقطۂ نظر کیا تھا- حیرت اس بات پر ہے کہ انہی اسلاف کے نام کو اوڑھ کر کس جرأت اور کس ڈھٹائی کے ساتھ اہلِ بیت کے دشمنوں اور یزید لعین کے دفاع کی جسارت کی جاتی ہے-

اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو (رضی اللہ عنہ) کا ایک اصول رہنمائی فراہم کرتا ہے، جو آپؒ نے اپنے پنجابی بیت میں عطا فرمایا ہے:

"اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" سنیا دل میرے نِت "قَالُوْا بَلٰى" کو کیندی ھو
حب وطن دی غالب ہوئی، ہک پل سون نہ دیندی ھو
قہر پووے تینوں رہزن دنیا توں تاں حق دا راہ مریندی ھو
عاشقاں مول قبول نہ کیتی باھوؒ توں نے کر کر زاریاں روندی ھو

ان اشعار کے ابتدائی دو مصرعوں میں محبوبِ حقیقی سے وصال کی تڑپ اور ازلی عہد کی بے قراری کا بیان ہے- "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کی صدا پر "قَالُوْا بَلٰى" کہنے والی روح جب اپنے اصل کی طرف لوٹنے کے اشتیاق میں مبتلا ہوتی ہے تو "حب وطن دی غالب ہوئی" کی یہی کشش اسے ایک لمحہ بھی چین نہیں لینے دیتی- یہی ازلی وعدہ، یہی عہدِ وفا، سیدنا حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کو میدانِ کربلا تک لے جاتا ہے، جہاں یہ بے قراری اپنی معراج کو پہنچتی ہے-

قہر پووے تینوں رہزن دنیا توں تاں حق دا راہ مریندی ھو

اس مصرعہ کے مفہوم میں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ امامِ عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی ذاتِ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے ایک معیار اور حدِ فاصل بنا دیا- آپ (رضی اللہ عنہ) کی قربانی نے حق و باطل کے درمیان ایسی لکیر کھینچ دی کہ جو حضرت امام عالی

مقام (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ہے وہ حق پر ہے، اور جو آپ (رضی اللہ عنہ) سے پھر گیا وہ حق سے منحرف ہو گیا-

یہاں اصل سوال یہی ہے کہ حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ وابستگی کی بنیاد کیا ہے اور آپ (رضی اللہ عنہ) سے انحراف کا سبب کیا ہے؟ حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی حمایت محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ شعوری و ایمانی مؤقف ہے- حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کا ساتھ اس لیے ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ ہیں، آپ (رضی اللہ عنہ) واقعۂ مباہلہ میں حق اور توحید کی دلیل بن کر سامنے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ (رضی اللہ عنہ) کو اپنی وحدانیت کی نشانیوں میں شامل فرمایا اور خود رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

"حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَأَنَا مِنْ حُسَیْنٍ"[1]

"حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں"-

یہی نسبت آپ (رضی اللہ عنہ) کی حقانیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور اسی میں وہ معیار پوشیدہ ہے جس سے ہر دور میں حق و باطل کو پہچانا جاتا ہے-

حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) سے محبت اس نسبت کی بنا پر کی جاتی ہے کہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے عمل سے واضح فرمایا، کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس شہزادہ کو اپنے دوشِ عزت پر سوار کیا- یہ محبت محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک شعوری تعلق ہے- جنت کے حصول کیلئے عام انسان کو کسب اور محنت درکار ہوتی ہے؛ نمازیں، روزے، حج اور نیک اعمال اس کے ذرائع بنتے ہیں اور اگر یہ نہ ہوں تو جنت کا راستہ دشوار ہو جاتا ہے- اس کے برعکس جب صحابۂ کرامؓ کی جماعت پر نظر ڈالی جائے، جنہیں جنت کی بشارت عطا ہوئی، تو ان کی زندگی مجاہدہ، قربانی اور مسلسل جدوجہد سے عبارت نظر آتی ہے-

حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت ابو عبیدہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد الرحمن بن عوف اور حضرت سعید بن زید (رضی اللہ عنہم) وہ نفوسِ ذکیہ ہیں جنہوں نے **سابقون الاولون** ہونے کا حق ادا کیا- انہوں نے مکہ کے مظالم سہے، ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معیت میں جہاد کیا، عبادات بجا لائیں، صدقات و خیرات کیے اور اپنی جانیں اللہ کی راہ میں نچھاور کیں، تب انہیں جنت کی بشارت عطا ہوئی-

جبکہ دوسری طرف حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی عمر مبارک وصالِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وقت ابھی ساڑھے چھ برس کے قریب تھی، نہ فرائض کی وہ تکمیل جو دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے حصے میں آئی، نہ وہ طویل مجاہدہ جس کے نتیجے میں درجات بلند ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کیلئے جو مقام متعین کیا گیا وہ محض جنت کی بشارت نہیں بلکہ یہ اعلان ہے کہ حضرات حسن و حُسین (رضی اللہ عنہما) جنتی جوانوں کے سردار ہوں گے- یہاں رتبہ محنت کے صلے میں نہیں بلکہ عطائے الٰہی کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، ایک ایسا مقام جو کسب سے ماورا اور انتخابِ ربانی کا مظہر ہے-

اسی بنا پر حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ وابستگی ایک اصولی مؤقف کی حیثیت اختیار کرتی ہے، جبکہ اس کے برخلاف جو مؤقف اختیار کیا جاتا ہے اس کی بنیاد محلِ سوال رہتی ہے- بعض تعبیرات میں اس واقعہ کو دو شہزادوں کے مابین ایک نزاع قرار دے کر اس کی معنویت کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ یہ تعبیر حقیقت کے جوہر کو سمیٹنے سے قاصر ہے- تاہم اگر اسی مفروضے کو وقتی طور پر قبول کر بھی لیا جائے تو بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ ان دو میں سے کس کا ساتھ اختیار کیا جائے اور اس انتخاب کی بنیاد کیا ہو-

ایک طرف وہ شہزادہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیۂ مباہلہ کے اندر اللہ کی وحدانیت کی دلیل بن کر سامنے آتا ہے، اس کی نسبت نصِّ قرآنی سے ثابت ہے اور اس کی حیثیت محض تاریخی نہیں بلکہ تائیدِ الٰہی کی حامل ہے- اگر

[1](سنن ترمذی، کتاب فضائل ومناقب)

معاملے کو سادہ کر کے اسے دو شہزادوں کے درمیان ایک نزاع قرار دے بھی دیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ دیکھا جائے کس شہزادے کو قرآن کریم نے ترجیح اور تقدیس عطا کی؟ اس ایک سوال کا جواب ڈھونڈیئے، بہت سے سوال حل ہو جائیں گے-

ہم تو حُسینؑ کا ساتھ ان نسبتوں سے دیتے ہیں جو نصِ قرآنی میں آیا ہے اور جو کثیر احادیث مبارکہ میں موجود ہے-

اس کے بالمقابل دوسری طرف ایسے افراد نظر آتے ہیں جو جبر کے تحت یا مفادات کے اسیر ہو کر ایک ایسے نظام کے ساتھ وابستہ ہوئے جس کی بنیاد قوت، لالچ اور دنیاوی ترغیبات پر قائم تھی، انہیں رتبے دیے گئے، عہدے عطا ہوئے، درہم و دینار سے نوازا گیا اور جاگیروں کے ذریعے وابستہ رکھا گیا-

وقت گزرنے کے ساتھ وہ شخص باقی نہیں رہا جو یہ سب کچھ دیتا تھا، نہ وہ درہم و دینار رہے، نہ وہ عطائیں اور مناصب، مگر اس کے باوجود اس فکر کے حامی باقی رہے- یہ امر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جیسے حسینیت ایک زندہ روایت کے طور پر اپنے ماننے والوں میں جاری ہے، ویسے ہی یزیدیت بھی ایک ذہنیت کی صورت میں اپنے پیروکاروں میں منتقل ہوتی رہی ہے- کہیں نہ کہیں دنیاوی مفاد، اقتدار کی کشش اور سماجی حیثیت کی خواہش اس تسلسل کو قائم رکھتی ہے- یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو اسلاف کے نام سے وابستہ کر کے دراصل ملوکیت کے مفادات کی حفاظت میں مصروف دکھائی دیتے ہیں-جن کے بارے میں حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جے کر دین علم وچ ہوندا تاں سر نیزے کیوں چڑھدے ھو
اٹھارہ ہزار جو عالم آہا اوہ اگے حسینؓ دے مردے ھو
جے کجھ ملاحظہ سرور (ﷺ) دا کردے تاں خیمے تمبو کیوں سڑدے ھو
جیکر مندے بیعت رسولی تاں پانی کیوں بند کردے ھو
پر صادق دین تنہاں دے باھوؒ جو سر قربانی کردے ھو

آپ (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے اس بیت شریف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ دیتے ہیں کہ بہت سے اہلِ علم ایسے گزرے جو حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کے سامنے آنے کے بجائے دنیاوی منفعت کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے- یہ وہ رویہ ہے جس میں علم اپنی اصل روح کھو دیتا ہے اور اقتدار کے قدموں میں قربان ہو جاتا ہے- ایسے افراد کے بارے میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم جب دنیا کے عوض فروخت ہو جائے تو وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے اور محض ایک ذریعۂ مفاد بن کر رہ جاتا ہے-

حسینیت دراصل عدل، انصاف، مساوات اور اخلاقی جرأت کا نام ہے، اور یہی وہ اقدار ہیں جن کے ساتھ استبداد، جبر اور ملوکیت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا- اسی لیے اس فکر کی مخالفت دراصل ان اقدار کی مخالفت ہے جو انسانی وقار اور حق کی پاسداری کو ممکن بناتی ہیں-

اس کے برعکس وہ لوگ جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور حضور نبی کریم (ﷺ) کی محبت راسخ تھی، جن کے سینوں میں اہلِ بیت کا عشق اور کتاب و سنت کی روشنی تھی، انہوں نے کبھی خود کو فروخت نہیں کیا- یہی اصل فرق ہے ان کے درمیان جو اپنے اصولوں کو دنیا کے عوض چھوڑ دیتے ہیں اور ان کے درمیان جو ہر قیمت پر اپنے ایمان، اپنے علم اور اپنی وابستگی کی حفاظت کرتے ہیں-ان کے بارے میں حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

عاشقاں مول قبول نہ کیتی باھوؒ توں نے کر کر زاریاں روندی ھو

غور طلب امر یہ ہے کہ سانحۂ کربلا 61ھ میں رونما ہوا، جب رسول اللہ (ﷺ) کے وصال کو تقریباً 50 برس گزر چکے تھے- اس مختصر فاصلے کے باوجود وہی گلیاں موجود تھیں،

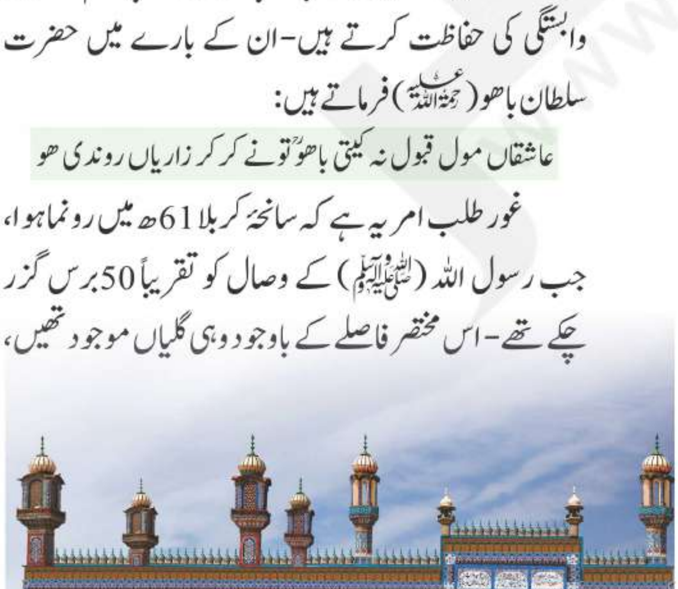

وہی مسجد، وہی راستے، وہی درخت اور وہی بستیاں باقی تھیں جو نزولِ وحی کی شاہد رہی تھیں، جنھوں نے جبریلِ امین (علیہ السلام) کو آتے جاتے دیکھا تھا اور جن کے سامنے یہ فرمان نازل ہوا تھا:

"قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"[2]

"آپ کہیے کہ میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا سوا قرابت کی مودت کے"۔

اس زمانے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کی نگاہوں کے سامنے قرآن مجید تدریجاً نازل ہوا اور جنھوں نے اس کے معانی کو براہِ راست سنا اور سمجھا۔

اس کے باوجود یہ سانحہ پیش آیا تو اہلِ علم نے اس آیت کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" سے مراد محض جذباتی محبت نہیں بلکہ ایسی محبت ہے جس میں حفاظت کا تقاضا مضمر ہو۔

حضرت سیدنا عبد اللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا:

"إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى يَعْنِيْ أَنْ تَحْفَظُوْا قَرَابَتِيْ"[3]

"اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" کا معنی یہ ہے کہ تم میری قرابت کی حفاظت کرو"۔

گویا مودّت اپنی حقیقت میں محافظت کو شامل رکھتی ہے، اگر حفاظت کا جذبہ موجود نہ ہو تو مودّت اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔

اسی پس منظر میں یہ سوال شدت سے ابھرتا ہے کہ جب یہ تعلیمات واضح تھیں، جب قرآن کریم کی آیات اور ان کی تشریحات لوگوں کے سامنے تھیں، تو پھر کیسے ممکن ہوا کہ امت کا ایک طبقہ اقتدار، خواہش اور دنیاوی جاہ و منصب کے پیچھے چل نکلا اور اس نے ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا جو کتابِ الٰہی نے متعین کیے تھے۔ حتیٰ کہ اسی غفلت کے نتیجے میں اہلِ بیت اور قرابتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حقوق بھی پسِ پشت ڈال دیے گئے۔

اہلِ سنت والجماعت کے معتبر مفسرین میں سے قاضی عمر البیضاوی (رحمۃ اللہ علیہ)، جن کی تفسیر مدارس میں سبقاً پڑھائی جاتی ہے، اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

"إِلَّا الْمَوَدَّةَ ثَابِتَةٌ فِيْ ذَوِي الْقُرْبٰى مُتَمَكِّنَةٌ فِيْ أَهْلِهَا"[4]

"میں تم سے ایسی مودت کا سوال کرتا ہوں جو میری اہل بیت کے لئے ثابت اور دائمی ہو"۔

مقصود یہ ہے کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آل اور قرابت کے ساتھ ایسی مودّت اختیار کی جائے جو "ثَابِتَةٌ" اور "مُتَمَكِّنَةٌ" ہو۔ اس تعبیر میں محض لفظی تاکید نہیں بلکہ ایک گہرا مفہوم پوشیدہ ہے۔

"ثَابِتَةٌ" سے مراد وہ محبت ہے جو پائیدار، برقرار اور غیر متزلزل ہو۔ ایسی محبت جس میں تسلسل ہو، جسے کوئی خلل لاحق نہ ہو، جو سچی اور آزمودہ ہو۔ اور "مُتَمَكِّنَةٌ" اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو دل و جان میں راسخ ہو چکی ہو، جو مضبوطی کے ساتھ قائم ہو، جو انسان کی باطنی ساخت کا حصہ بن جائے۔ یہ وہ مودّت ہے جو وقتی جذبے یا وقتی وابستگی کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو انسان کی زندگی میں اس طرح سرایت کر جائے کہ اس کے بغیر وجود کا تصور ادھورا محسوس ہو۔ یہی وہ معیار ہے جسے اسلاف نے بیان کیا اور یہی وہ نکتہ ہے جو اس امر کو سمجھنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ محض نام لینے سے نسبت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس نسبت کا حق ادا کرنا، اس کی حفاظت کرنا اور اسے اپنے وجود میں راسخ کرنا ہی اصل تقاضا ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب لوگ ان آیات اور احادیث کو یاد رکھتے تھے، وہ افراد موجود تھے جنھوں نے براہِ راست سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے یہ احادیث سنی تھیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مقام پر تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

"أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ"

[2](الشوریٰ:23)

[3](تفسیر بغوی، زیر آیت الشوریٰ:23)

[4](تفسیر بیضاوی، زیر آیت الشوریٰ:23)

"میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں"-

"أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي"

"میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں"-

"أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي"[5]

"میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں"-

پھر آپ (ﷺ) نے امت کو واضح پیغام دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَّفْسِهٖ وَيَكُوْنَ عِتْرَتِيْ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ عِتْرَتِهٖ وَتَكُوْنَ ذَاتِيْ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ ذَاتِهٖ وَيَكُوْنَ أَهْلِيْ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَهْلِهٖ"[6]

"کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی جان سے بھی محبوب تر نہ ہو جاؤں اور میرے اہلِ بیت اسے اس کے اہل خانہ سے محبوب تر نہ ہو جائیں اور میری اولاد اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جائے اور میری ذات اسے اپنی ذات سے محبوب تر نہ ہو جائے"-

یہ سب کچھ ان کے علم میں ہونے کے باوجود تاریخ نے وہ مناظر دیکھے جو عقل کو حیران کر دیتے ہیں- اگر یہی تعلیمات حکمرانوں اور ان کے کارندوں کے سامنے پوری معنویت کے ساتھ موجود رہتیں تو کیا وہ واقعات پیش آ سکتے تھے جو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ساتھ پیش آئے؟ وہ حضور مولا علی (رضی اللہ عنہ) جو دامادِ رسول تھے، جن کے بارے میں اُن کی محبت کو ایمان اور بغض کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا، وہ مولا علی (رضی اللہ عنہ) جن کے ذکر اور دیدار کو رسول کریم (ﷺ) نے عبادت فرمایا، لیکن ان سب فضائل کے باوجود اُنہیں حالتِ نماز میں مسجدِ کوفہ میں شہید کر دیا گیا- اور یہ فعل کسی بیرونی دشمن نے نہیں بلکہ انہی لوگوں نے انجام دیا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے-

سیدنا امام حسن المجتبیٰ (رضی اللہ عنہ)، جنہیں رسول اللہ (ﷺ) نے اپنی امت کے لیے صلح کا وسیلہ قرار دیا، جنہیں جنتی جوانوں کا سردار فرمایا، جنہیں اپنی خوشبو فرمایا، انہیں زہر دے کر شہید کیا گیا- اس کے بعد بھی سلسلہ نہ رُکا، اقتدار کی خواہش اور دنیاوی حرص اس حد تک غالب آگئی کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی تمام تعلیمات پس پشت ڈال دی گئیں- یہاں تک کہ کربلا میں وہ دل خراش سانحہ پیش آیا جس میں رسول اللہ (ﷺ) کے نواسے، ان کے اہلِ بیت اور ان کے معصوم اہل و عیال کو بے دردی سے شہید کیا گیا-

یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ وہ کون سی قوت تھی جس نے آنکھوں کو اندھا اور دلوں کو بے حس کر دیا، حالانکہ حق واضح تھا اور اس کے دلائل بھی روشن تھے- اس کا جواب اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ جب دنیا کی محبت، اقتدار کی حرص اور باطنی بغض انسان پر غالب آ جاتے ہیں تو وہ حق کو دیکھتے ہوئے بھی اس سے منہ موڑ لیتا ہے- یہی وہ کیفیت ہے جسے بیان کرتے ہوئے حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا:

قہر پووے تینوں رہزن دنیا توں تاں حق دا راہ مریندی ھو

یعنی دنیا کا لالچ انسان کیلئے رہزن بن جاتا ہے اور اسے حق کے راستے سے ہٹا دیتا ہے- اسی بنا پر آقا کریم (ﷺ) نے اہلِ بیت کی مودّت کو لازم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) قَالَ: اَلْزِمُوْا مَوَدَّتَنَا أَهْلَ الْبَيْتِ، فَإِنَّهٗ مَنْ لَقِيَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَهُوَ يَوَدُّنَا دَخَلَ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَتِنَا، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ: لَا يَنْفَعُ عَبْدًا عَمَلُهٗ إِلَّا بِمَعْرِفَةِ حَقِّنَا"

"حضرت حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ہم اہل بیت کی محبت کو لازم پکڑو کیونکہ جو شخص اس حال میں اللہ سے ملا کہ وہ ہم سے محبت کرتا تھا تو وہ ہماری شفاعت کے صدقے جنت میں داخل ہو گا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت

[5] (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ)

[6] (شعب الایمان)

میں میری جان ہے کسی شخص کو اس کا عمل فائدہ نہیں دے گا مگر ہمارے حق کی معرفت کے سبب"۔

یہ حدیث پاک اس امر کو واضح کرتی ہے کہ محبتِ اہلِ بیت محض ایک اضافی فضیلت نہیں بلکہ ایمان اور نجات کے باب میں ایک بنیادی تقاضا ہے۔ اگر علم اور عمل اس معرفت سے خالی ہوں تو وہ اپنی روح کھو دیتے ہیں اور محض ظاہری دعووں تک محدود رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے رویّے، اپنے عقیدے اور اپنی وابستگی کو اسی میزان پر پرکھے کہ آیا اس میں اہلِ بیت کے حق کی پہچان اور اس کے مطابق سچی مودّت موجود ہے یا نہیں۔

اسی تناظر میں اصل سوال یہ ابھرتا ہے کہ اہلِ بیت کے حق کو کس طرح پہچانا جائے۔ اس کا جواب وہی ہے جو اسلافِ امت نے اپنے عمل اور اپنے فہم سے دیا۔ انہوں نے اس حق کو محض الفاظ میں نہیں بلکہ اپنے عقیدے، اپنے طرزِ فکر اور اپنے عملی رویّے میں ظاہر کیا، اور یہی وہ معیار ہے جس کی طرف رجوع کیے بغیر اس نسبت کی حقیقت کو سمجھنا ممکن نہیں۔

اہلِ سنت کے فقہی مکاتب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی، اپنے آئمہ کے ذریعے نہ صرف علمی روایت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اہلِ بیت کے ساتھ وابستگی اور ان کے حق کی پہچان کا عملی نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔ امامِ اعظم ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل (رضی اللہ عنہم) ان چاروں آئمہ کی زندگیاں اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اہلِ بیت کی محبت کو محض ایک تاریخی بحث یا تفسیری نکتہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اپنے عقیدے اور طرزِ عمل میں نمایاں کیا۔

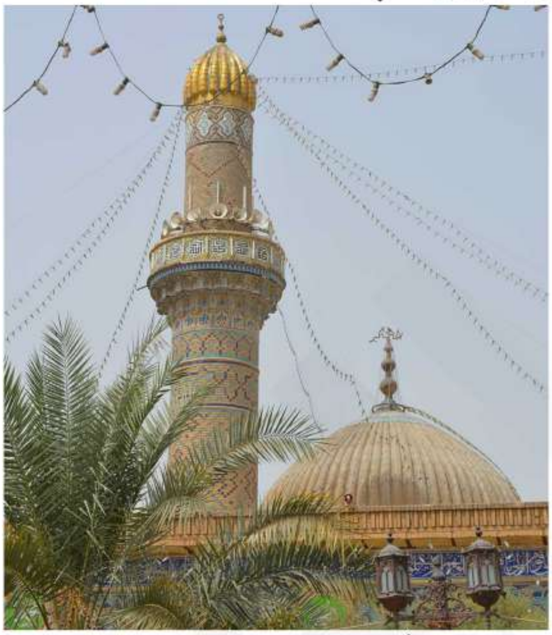

امام ابو حنیفہ، جن کا پورا نام نعمان بن ثابت الکوفی ہے، کوفہ میں مقیم تھے اور یہی وہ شہر تھا جہاں سیدنا زید بن زین العابدین بن حسین بن علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) کی تحریک نے قوت حاصل کی۔ 122ھ میں جب امام زید نے بنو امیہ کے اقتدار کے خلاف خروج فرمایا تو اس وقت خلافت ہشام بن عبد الملک کے ہاتھ میں تھی اور سلطنت کا دائرہ عراق و حجاز سمیت وسیع خطوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں امام زید (رضی اللہ عنہ) کی آواز پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے اور اسی موقع پر امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان کی تائید میں فتویٰ صادر کیا۔

یہ محض ایک نظری حمایت نہ تھی بلکہ ایک عملی مؤقف تھا۔ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے شاگردوں، اہلِ کوفہ اور اپنے متبعین کو ہدایت دی کہ وہ امام زید (رضی اللہ عنہ) کا ساتھ دیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایک حق پر مبنی قیام و اقدام تھا۔ ان کے متعدد شاگرد اور قریبی افراد اس تحریک میں شریک ہوئے اور میدانِ عمل میں اترے۔ خود امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کسی عذر کے باعث براہِ راست شریک نہ ہو سکے، تاہم انہوں نے مالی معاونت کے ذریعے اپنی وابستگی کا اظہار کیا اور اس مقصد کیلئے 10000 درہم فراہم کیے، جو اس دور کے اعتبار سے ایک بڑی رقم تھی۔

122ھ کے اس واقعہ کے بعد 126ھ میں حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ہشام بن عبد الملک کی موت کے بعد مروان ثانی بر سرِ اقتدار آیا، جو بنو امیہ کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ اس کے دور میں عراق کی گورنری یزید بن عمر بن ہبیرہ کے سپرد کی گئی، جس نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کیلئے علمی شخصیات کو عہدوں کی پیشکش کر کے ایک منظم نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں اس نے کوفہ میں مقیم امامِ

اعظم ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کو بھی بلایا اور انہیں وزیرِ خزانہ جیسے اہم منصب سنبھالنے کی دعوت دی۔

امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کیلئے یہ محض ایک سرکاری عہدہ نہ تھا بلکہ ایک اصولی فیصلہ تھا، کیونکہ وہ بنو امیہ کی حکومت کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور خلافت و امارت کے باب میں اہلِ بیت کے حق کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس پیشکش کو دوٹوک انداز میں مسترد کر دیا۔ اس انکار کے بعد ان پر دباؤ بڑھایا گیا، اور ارد گرد کے لوگوں نے بھی مصلحت کا مشورہ دیا کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ منصب قبول کر لینا چاہیے، مگر امامِ اعظم اپنے مؤقف پر ثابت قدم رہے۔

ان کی استقامت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے فرمایا اگر اسے یہ بھی گوارا ہو کہ وہ صرف کوفہ کی مسجدوں کے دروازے گن کر بتا دیں تو وہ یہ معمولی سا کام بھی اس کے حکم پر انجام نہیں دیں گے، چہ جائیکہ وہ اس کے نظام کا حصہ بنیں۔ اس واضح انکار کے نتیجے میں انہیں سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا اور تاریخ میں مذکور ہے کہ انہیں روزانہ کوڑے لگائے جاتے تھے، مگر اس تمام جبر کے باوجود انہوں نے اپنے اصول سے انحراف نہ کیا اور اپنے مؤقف پر قائم رہے۔

132ھ اموی دور کا خاتمہ ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی ظلم و جبر کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا جس میں عباسی حکومت قائم ہوئی۔ ابتدا میں عبداللہ سفاح العباسی نے اعتدال کا تاثر دینے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی اس کی حکمرانی میں وہی سختی اور جبر نمایاں ہونے لگا جس کی مثالیں پہلے گزر چکی تھیں۔ اس کے بعد 136ھ میں اس کے انتقال کے ساتھ ابو جعفر منصور برسرِ اقتدار آیا اور اس کے عہد میں حالات نے مزید شدت اختیار کی۔

اسی زمانے میں مدینہ منورہ کے لوگوں نے عباسی اقتدار کو قبول کرنے سے انکار کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اہلِ بیت کی حمایت کریں گے۔ اس مقصد کیلئے سیدنا امام حسن مثنیٰ (رضی اللہ عنہ) کے پوتے اور امام حسن (رضی اللہ عنہ) کے پرپوتے امام محمد نفسِ زکیہ (رضی اللہ عنہ) کا انتخاب کیا۔ 145ھ میں انہوں نے عباسی حکومت کے خلاف اعلانِ حق بلند کیا۔ اس موقع پر امامِ اعظم ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) جو کوفہ میں موجود تھے، نے ایک بار پھر اہلِ بیت کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انہوں نے امام محمد نفسِ زکیہ (رضی اللہ عنہ) کی تائید میں فتویٰ دیا کہ وہ امیر برحق ہیں اور ان کی اطاعت کی جانی چاہیے۔

اسی طرح مدینہ میں امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ)، جو دارالہجرت کے امام کہلاتے ہیں، نے بھی یہ مؤقف اختیار کیا کہ جبر کے تحت لی گئی بیعت شرعاً معتبر نہیں ہوتی اور لوگوں کو اہلِ بیت کی قیادت کی طرف متوجہ کیا۔ امام محمد نفس زکیہ (رضی اللہ عنہ) کی تحریک ایک بڑی اور مؤثر تحریک تھی، جس نے عباسی اقتدار کو سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ تاریخی روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ابو جعفر منصور اس قدر ذہنی دباؤ کا شکار تھا کہ طویل عرصہ سکون سے نہ سو سکا اور اس کے دل میں مسلسل خوف و اندیشہ موجود رہا۔ تاہم بالآخر اس معرکے کا اختتام امام محمد نفسِ زکیہ (رضی اللہ عنہ) کی شہادت پر ہوا۔

ان کے بعد ان کے بھائی امام ابراہیم نفسِ مرضیہ (رضی اللہ عنہ) نے قیام کیا اور امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مرتبہ پھر ان کی حمایت میں فتویٰ دیا اور ان کے مؤقف کی تائید کی۔ لیکن یہ تحریک بھی بالآخر دب گئی اور عباسی اقتدار نے اپنے تسلط کو برقرار رکھا۔ یہ تمام واقعات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اسلاف کے نزدیک اہلِ بیت کے حق کا ادراک محض نظری وابستگی نہ تھا بلکہ اس کے لیے واضح مؤقف اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

امامِ اعظم ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے گرد ایک وسیع حلقۂ ارادت اور علمی اثر و رسوخ موجود تھا۔ ان کے شاگردوں اور متبعین میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے مؤثر حیثیت رکھتے تھے اور یہی اثر تھا کہ جب امام ابراہیم نفسِ زکیہ (رضی اللہ عنہ) نے قیام کیا تو بہت سے بااثر لوگ عباسی اقتدار کو چھوڑ کر ان کے ساتھ جا ملے۔ جب یہ معرکہ اپنے انجام کو پہنچا تو ابو جعفر منصور نے مخالفین کو طلب کیا اور امام ابو حنیفہ کو بھی دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

دربار میں ان سے پوچھا گیا کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے، تو لوگوں نے امام اعظم کا نام لیا- اس پر منصور نے انہیں قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا، مگر امام ابو حنیفہ نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہ اس ذمہ داری کے اہل نہیں- منصور نے اسے انکار نہیں بلکہ عذر سمجھ کر اصرار کیا اور کہا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں، جس پر امام نے نہایت حکمت سے جواب دیا کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو جھوٹا شخص قضا کے منصب کا اہل کیسے ہو سکتا ہے- اس مکالمے کے بعد منصور غضبناک ہوا اور انہیں قید کر دیا گیا-

قید کے دوران انہیں سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، روزانہ کوڑے لگائے جاتے، مگر اس کے باوجود وہ اپنے مؤقف سے پیچھے نہ ہٹے- ان کی علمی حیثیت برقرار رہی اور ان کے شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی جیسے نامور اہلِ علم ان سے علم حاصل کرتے رہے- وقت گزرنے کے ساتھ ان کی شہرت اور اثر و رسوخ میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا گیا، جس نے حکمران کو مزید تشویش میں مبتلا کیا-

بالآخر اس اندیشے کے تحت کہ وہ آئندہ بھی اہلِ بیت کے حق میں آواز اٹھائیں گے، انہیں خاموش کرنے کی کوشش کی گئی- روایات کے مطابق قید ہی میں انہیں زہر دیا گیا جس کے نتیجے میں ان کا انتقال ہوا- یہ تمام واقعات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ امام ابو حنیفہ کی اہل بیت کے ساتھ وابستگی محض قولی نہ تھی بلکہ عملی، مالی اور فکری ہر سطح پر قائم تھی- 122ھ سے لے کر ان کے وصال 145ھ تک ایک طویل عرصہ انہوں نے اسی استقامت کے ساتھ گزارا، نہ کسی ظالم اقتدار کا منصب قبول کیا اور نہ اپنے اصولوں سے انحراف کیا، بلکہ ہر حال میں اہلِ بیت کے حق کو ترجیح دی-

امام اعظم ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی اہل بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) سے محبت کو بیان کرتے ہوئے امام ابن حجر ہیتمی "الصواعق المحرقہ" میں فرماتے ہیں:

"وَكَانَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ (رضی اللہ عنہ) يُعَظِّمُ أَهْلَ الْبَيْتِ كَثِيْرًا وَّيَتَقَرَّبُ بِالْإِنْفَاقِ عَلَى الْمُتَسَتِّرِيْنَ مِنْهُمْ وَالظَّاهِرِيْنَ حَتّٰى قِيْلَ إِنَّهٗ بَعَثَ إِلٰى مُتَسَتِّرٍ مِّنْهُمْ بِاِثْنَيْ عَشَرَ أَلْفًا دِرْهَمٍ وَكَانَ يَحُضُّ أَصْحَابَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ"

"امام ابو حنیفہ اہل بیت کی بہت زیادہ تعظیم کرتے اور ان میں سے مستور الحال اور غیر مستور الحال احباب پر خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے- یہاں تک کہا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ان میں سے ایک مستور الحال فرد کو 12 ہزار درہم بھجوائے اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس پر ابھارتے تھے (کہ وہ بھی اہل بیت اطہار کی خدمت کیا کریں)-

امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ)، جو امامِ دار الہجرت کے لقب سے معروف ہیں اور اہلِ سنت کے جلیل القدر ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، ان کی سیرت بھی اہلِ بیت کے ساتھ وابستگی اور ان کے حق کے ادراک کی روشن مثال پیش کرتی ہے- جس دور میں امام محمد نفس زکیہ (رضی اللہ عنہ) نے مدینہ منورہ میں قیام کیا، جو سیدنا امام حسن (رضی اللہ عنہ) کی آل پاک سے تھے، اسی وقت عباسی اقتدار اپنی بیعت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا- ایسے نازک حالات میں امام مالک نے ایک اصولی فتویٰ دیا کہ جبر کے تحت لی گئی بیعت شرعاً معتبر نہیں ہوتی، جیسے جبر کے تحت دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی- اس استدلال کے ذریعے انہوں نے واضح کیا کہ بیعت کا تعلق دل کی رضامندی سے ہے، نہ کہ طاقت کے دباؤ سے- اسی بنا پر انہوں نے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی بیعت ایسے شخص کے ہاتھ پر رکھیں جو اہلِ بیت میں سے ہو اور جس کا حق واضح ہو، اور اس طرح انہوں نے امام محمد نفس زکیہ (رضی اللہ عنہ) کی تائید کا راستہ اختیار کیا- بعد ازاں جب ان کے بھائی امام ابراہیم نفسِ مرضیہ (رضی اللہ عنہ) نے قیام کیا تو اس موقع پر بھی یہی اصولی مؤقف برقرار رہا-

یہ مؤقف حکمرانوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھا- مدینہ میں عباسی گورنر جعفر بن سلیمان تک شکایات پہنچائی گئیں کہ امام مالک اپنے فتاویٰ کے ذریعے لوگوں کو موجودہ اقتدار سے دور کر رہے ہیں- تو اس نے حکم دیا:

"فَأَمَرَ بِتَجْرِيدِهِ، وَضَرْبِهِ بِالسِّيَاطِ، وَجُبِذَتْ يَدُهُ حَتَّى انْخَلَعَتْ مِنْ كَتِفِهِ، وَارْتُكِبَ مِنْهُ أَمْرٌ عَظِيمٌ"[7]

امام مالک کو برہنہ کر کے کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا- چنانچہ انہیں مارا گیا، اوران کا بازو اتنی شدت سے کھینچا گیا یہاں تک کہ کندھے سے اتر گیا اور ان کے ساتھ بہت سنگین سلوک کیا گیا"-

اصل سبب یہی تھا کہ ان کی علمی حیثیت اور اثر و رسوخ کے باعث اہلِ حجاز کی ایک بڑی تعداد عباسی بیعت سے گریزاں ہو رہی تھی- یہ واقعات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اہلِ بیت کے ساتھ محبت اور ان کے حق کا اعتراف کسی ایک طبقے یا کسی مخصوص مکتبِ فکر تک محدود نہ تھا، بلکہ یہ اہلِ سنت کے اکابر آئمہ کی عملی روایت کا حصہ تھا- یہ وہ ہستیاں تھیں جو فقہ، اجتہاد اور علم کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھیں، اور ان کا طرزِ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) کی محبت اور ان کے حق کی پہچان ایک اصولی اور ہمہ گیر قدر ہے-

امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس الشافعی (رحمۃ اللہ علیہ)، جو فقہِ شافعی کے بانی ہیں، ان کی سیرت بھی اہلِ بیت کے ساتھ قلبی وابستگی اور اصولی استقامت کی نمایاں مثال پیش کرتی ہے- ان کا زمانہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا دور تھا اور اسی عہد میں انہیں مصر میں منصبِ قضا پر فائز کیا گیا- مگر ہر دور کی طرح اس زمانے میں بھی ایسے افراد موجود تھے جو منصب کو امانت کے بجائے مفاد کا ذریعہ بنا چکے تھے اور ایک دیانتدار قاضی ان کے لیے ناگوار تھا-

جب امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کی دیانت، عدل اور علمی وقار نے معاشرتی سطح پر اثر ڈالنا شروع کیا تو بعض عناصر نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں- اتفاقاً مصر میں کچھ سادات سے ان کی ملاقات کو بنیاد بنا کر خلیفہ کے پاس یہ خبریں بھیجی گئیں کہ امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) اہلِ بیت (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ مل کر بغاوت کا ارادہ رکھتے ہیں- ان الزامات کے نتیجے میں انہیں گرفتار کر کے ہتھکڑیوں میں بغداد لایا گیا-

اس وقت کا ماحول اس قدر سخت تھا کہ سادات کے خلاف سخت کارروائیاں کی جا رہی تھیں اور امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) بھی اس فضا سے محفوظ نہ رہے- ان کے خلاف بھی سخت اقدام کا اندیشہ پیدا ہو گیا، مگر جب انہیں خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے نہایت حکمت اور علم کے ساتھ اپنا مؤقف بیان کیا- اہلِ علم، خصوصاً ان کے اساتذہ نے سفارش کی کہ ایسے جلیل القدر عالم کو محض شبہات یا اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) سے نسبت کی بنیاد پر نقصان پہنچانا ایک بڑی محرومی ہو گی- چنانچہ ان کی جان بخشی ہوئی، لیکن ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ بغداد میں وعظ و خطاب نہیں کریں گے-

اس پابندی کے باوجود انہوں نے اظہارِ حق کا ایک نیا راستہ اختیار کیا- انہوں نے حبِ اہلِ بیت کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا اور قصائد کے ذریعے اپنے جذبات و عقائد کو عام کرنا شروع کیا- یہ اشعار زبان زدِ عام ہوئے، لوگوں نے انہیں یاد کیا اور یوں علمی و ادبی انداز میں محبتِ اہلِ بیت کا پیغام پھیلتا چلا گیا- امام شافعی کا دیوان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ان کے نزدیک اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) سے محبت نہ صرف ایک

[7] (اَلْاِنْتِقَاءُ فِي فَضَائِلِ الثَّلَاثَةِ الْأَئِمَّةِ الْفُقَهَاءِ)

دینی قدر تھی بلکہ ایک زندہ اور متحرک احساس تھا، جسے وہ ہر حال میں بیان کرتے رہے۔ آپ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

لَئِنْ كَانَ ذَنْبِيْ حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ
فَذٰلِكَ ذَنْبٌ لَسْتُ عَنْهُ أَتُوْبُ

"پس اگر (حکمرانوں کی نظر میں) آل محمد (ﷺ) کی محبت میرا گناہ ہے تو یہ گناہ وہ ہے جس سے میں کبھی توبہ نہیں کروں گا"۔

هُمْ شُفَعَائِيْ يَوْمَ حَشْرِيْ وَ مَوْقِفِيْ
إِذَا مَابَدَتْ لِلنَّاظِرِيْنَ خُطُوْبُ

"وہ (اہلبیت) میرے شفیع اور ملجاو ماویٰ ہیں میرے حشر کے دن، جب قیامت والے دن ان کی شان ظاہر ہو گی"۔

آلَ النَّبِيِّ ذَرِيْعَتِيْ
وَ هُمُوْ اِلَيْهِ وَسِيْلَتِيْ

"آل نبی (ﷺ) بارگاہ الٰہی میں میرا ذریعہ اور وسیلہ ہیں"۔

أَرْجُوْ بِهِمْ أُعْطٰى غَدًا
بِيَدِ الْيَمِيْنِ صَحِيْفَتِيْ

"اُمید ہے کل قیامت کے دن ان کے وسیلے سے مجھے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا"۔

تَأَوَّهَ قَلْبِيْ وَالْفُؤَادُ كَئِيْبُ
وَ أَرَّقَ نَوْمِيْ فَالسُّهَادُ عَجِيْبُ

"میرا دل غمزدہ ہو گیا اور میرا فواد شکستہ ہے: میری نیند اڑ گئی عجیب و غریب قسم کی بے خوابی ہے"۔

فَمَنْ مُّبَلِغٌ عَنِّيْ الْحُسَيْنَ رِسَالَةً
وَاِنْ كَرِهَتْهَا أَنْفُسٌ وَّقُلُوْبُ

"پس کون ہے جو میرا خط حضرت سیدنا حسینؓ تک پہنچائے والا اگرچہ نفوس اور قلوب اسے ناپسند ہی کریں"۔

ذَبِيْحٌ بِلَا جُرْمٍ، كَأَنَّ قَمِيْصَهُ
صَبِيْغٌ بِمَاءِ الْأُرْجُوَانِ خَضِيْبُ

"آپؓ بغیر کسی جرم کے ذبح ہوئے، آپؓ کا کرتہ گویا سرخ رنگ سے رنگا ہوا ہے"۔

تَزَلْزَلَتِ الدُّنْيَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ
وَكَادَتْ لَهُمْ صُمُّ الْجِبَالِ تَذُوْبُ

"دنیا آل محمد (ﷺ) کے لئے متزلزل ہو گئی قریب تھا کہ پہاڑوں کی سختی بھی زائل ہو جائیگی"۔

وَ غَارَتْ نُجُوْمٌ وَّاقْشَعَرَّتْ كَوَاكِبُ
وَ هُتِّكَ أَسْتَارٌ، وَشُقَّ جُيُوْبُ

"(آلِ محمد (ﷺ) کے غم میں) ستارے غروب ہو گئے اور کواکب مرجھا گئے یہ پردے چاک ہو گئے اور گریباں پھٹ گئے"۔

يُصَلّٰى عَلَى الْمَبْعُوْثِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ
وَ يُغْزٰى بَنُوْهُ! اِنَّ ذَالَعَجِيْبُ

"یہ عجیب بات ہے کہ ہم بنو ہاشم کے منتخب مرد (رسول کریم (ﷺ)) پر درود بھیجتے ہیں جبکہ ان کی اولاد کو اذیت پہنچاتے ہیں"۔

قَالُوْا تَرَفَّضْتَ قُلْتُ: كَلَّا
مَاالرَّفْضُ دِيْنِيْ وَلَا اِعْتِقَادِيْ

"لوگوں نے کہا کہ آپ رافضی ہو گئے ہیں (میں نے جواب دیا) ہرگز نہیں رافضی مسلک نہ میرا دین ہے نہ میرا عقیدہ ہے"۔

لٰكِنْ تَوَلَّيْتُ غَيْرَ شَكٍّ
خَيْرَ اِمَامٍ وَ خَيْرَ هَادِيْ

"لیکن بے شک میں تو حضرت علیؓ سے دوستی رکھتا ہوں جو تمام اماموں اور ہادیوں سے بہتر ہے"۔

اِنْ كَانَ حُبُّ الْوَلِيِّ رَفْضًا
فَاِنَّ رَفْضِيْ اِلَى الْعِبَادِ

"اگر حضرت علیؓ کی محبت سے انسان رافضی ہو جاتا ہے تو میں سب سے بڑا رافضی ہوں"۔

اِنْ كَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ
فَلْيَشْهَدَا الثَّقَلَانِ اَنِّيْ رَافِضِيْ

"(انہیں یہ کہہ دو) کہ اگر آلِ محمد (ﷺ) کی محبت کا نام رفض ہے تو اس کائنات ارضی کے تمام جن و انس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں"۔

يَا آلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ حُبُّكُمْ
فَرْضٌ مِّنَ اللهِ فِي الْقُرْآنِ أَنْزَلَهُ

"اے اہل بیت رسول اللہ (ﷺ)! تمہاری محبت اللہ کے نازل کردہ قرآن مجید میں فرض قرار دی گئی ہے"۔

يَكْفِيكُمْ مِنْ عَظِيمِ الْفَخْرِ أَنَّكُمْ
مَنْ لَّمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَاةَ لَهُ

"تمہارے عظیم المرتبت ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی"۔

امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے اشعار اور اقوال میں اس تضاد کی نشاندہی کی جس میں ایک طرف لوگ اپنے آپ کو عبادت گزار ظاہر کرتے ہیں، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود بھیجتے ہیں، مگر دوسری طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آل کے بارے میں ایسے رویّے اختیار کرتے ہیں جو اس درود کی روح کے منافی ہوتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ ایک گہرا فکری اور اخلاقی تضاد تھا کہ زبان سے محبت کا دعویٰ ہو اور عمل میں اس کے تقاضے پورے نہ کیے جائیں۔

اسی تناظر میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا کہ آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کو کسی منفی تعبیر میں پیش کرنا یا اسے غلط معنی پہنانا دراصل اس تعلیم کے خلاف ہے جسے دین نے بطورِ قدر قائم کیا ہے۔محبتِ اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) ایک ایسا اصول ہے جو انسان کے باطن، اس کے اخلاق اور اس کے رویّے میں ظاہر ہونا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے حقیقی محبت اسی وقت معتبر ہو سکتی ہے جب ہمارے دلوں میں اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) کے لئے احترام اور محبت ہو۔اس کے بغیر محبت کا دعویٰ ادھورا رہ جاتا ہے اور ایک عملی تضاد کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔اس اصولی موقف میں نہ شدت ہے اور نہ کسی کے لیے نفرت، بلکہ ایک فکری توازن ہے جو محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور محبتِ اہلِ بیت کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں قرار دیتا ہے۔

بزبانِ بیدم وارثی:

بیدم یہی تو پانچ ہیں، مقصودِ کائنات
خیر النساءؓ، حسینؓ و حسنؓ، مصطفیٰؐ، علیؓ

چوتھے امام، سیدنا امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی سیرت اور اقوال بھی اسی تسلسل کو واضح کرتے ہیں جس میں اہلِ بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ وابستگی ایک اصولی اور ایمانی تقاضے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ان کے بارے میں متعدد اکابر علماء، ابنِ حجر ہیتمی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، جلال الدین سیوطی، قاضی ابو یعلیٰ، علامہ ابنِ جوزی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے آئمہ کرام نے روایات نقل کی ہیں، جنہیں حنابلہ کے بڑے طبقے نے بھی قبول کیا اور اپنی کتب میں محفوظ رکھا۔

امام احمد کے پوتے صالح بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"میں نے اپنے والد امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) سے عرض کیا: کچھ لوگ ہمیں یزید کی طرف منسوب کرتے ہیں (یعنی ہم اسے اچھا سمجھتے ہیں)۔تو امام احمد (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا:

يَا بُنَيَّ هَلْ يَسُوْغُ لِمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللهِ اَنْ يُّحِبَّ يَزِيْدَ وَلِمَ لَا يَلْعَنُ رَجُلٌ لَّعَنَهُ اللهُ فِيْ كِتَابِهٖ

"اے بیٹے! کیا کسی مومن کیلئے جائز ہے کہ وہ یزید سے محبت کرے؟ ایک بندہ یزید پر لعنت کیوں نہ کرے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس پر لعنت کی"۔

میں نے عرض کی کہ ابا جان اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں کہاں یزید پر لعنت کرتا ہے؟ امام احمد نے فرمایا: جہاں اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

"فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ"[8]

[8] (سورہ محمدؐ: 22-23)

"تم سے یہ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو زمین میں حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد کرو گے اور رشتے توڑ ڈالو گے- یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی تو ان کو بہرا بنادیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا"-

تو امام احمد (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: کیا فسادِ فی الارض میں قتلِ حسینؓ سے بڑا بھی کوئی جرم ہو سکتا ہے؟[9]

امام جلال الدین السیوطیؒ (المتوفی: 911ھ) فرماتے ہیں:

"لَعَنَ اللهُ قَاتِلَهُ وَابْنَ زِيَادٍ مَعَهُ وَيَزِيْدَ أَيْضًا"[10]

"اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس (یعنی حسین کو) قتل کرنے والے پر اور اُسی کے ساتھ ابن زیاد اور یزید پر بھی"-

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے "تفسیر مظہری" میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

حَيْثُ قُتِلَ اِبْنُ بِنْتِ رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) وَأَهَانَ عِتْرَتَهُ وَافْتَخَرَ بِهِ وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ بِيَوْمِ بَدْرٍ

جہاں رسول (ﷺ) کی بیٹی کے بیٹے کو قتل کیا گیا، اور اہلِ بیتِ نبوت کے دیگر افراد کو بھی قتل کیا گیا اور اہلِ بیت کی بے حرمتی کی گئی اور اس پر فخر محسوس کیا گیا، اور کہا گیا: یہ دن بدر کے دن جیسا ہے-

اس نے ایک فوج بھیجی رسول (ﷺ) کے شہر مدینہ پر، اور ویسا ہی کچھ کیا جیسا واقعہ حُرّہ میں مدینہ اور اس کی مسجد (مسجد نبوی) کے ساتھ کیا گیا، جو آغازِ اسلام سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم تھی اور وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے- اس نے اللہ کے گھر (کعبہ) کے اطراف منجنیقیں نصب کیں اور ابن الزبیر جو حضرت ابو بکر کے نواسے تھے، اسے قتل کیا

"حَتّٰى كَفَرَ بِدِيْنِ اللهِ وَأَبَاحَ الْخَمْرَ"

"یہاں تک کہ اس نے اللہ کے دین کا انکار کر دیا اور خمر (شراب) کو حلال قرار دیا"-

یہ نام نہاد ملوکیتوں کے پروردہ جو یزید ملعون کے حق ہونے پہ استدلال کرتے ہیں اور واقعہ کربلا میں حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں- یاد رکھیں! اگر یزید لعین حق پہ حکمران ہوتا، تو نہ کربلا کا سانحہ ہوتا اور نہ مدینے کی بے حرمتی کا واقعہ پیش آتا- کیونکہ اگر یزید لعین حق پر ہوتا تو سب سے پہلے مدینہ منورہ کی حرمت قائم کرتا- مدینہ منورہ کی حرمت کا پامال ہونا یہ دلیل ہے کہ یزید لعین ناحق تھا- جب یزید لعین کا اقتدار ناحق ہے، تو قتلِ حسین بھی ناحق ہوا-

مدینہ منورہ شہر رسول تھا اور حُسین (رضی اللہ عنہ) جانِ رسول تھا- مدینہ منورہ میں رسول اللہ (ﷺ) کا جسد اقدس تھا اور امام حسین (رضی اللہ عنہ) میں رسول اللہ (ﷺ) کا خون تھا- تو وہ حکمران کیسے حق پہ ہو سکتا ہے جس نے شہر رسول (ﷺ) کو پامال کیا اور جانِ رسول (ﷺ) کو اذیت دی؟

مدینہ منورہ نے اسلام کو بڑھایا لیکن یزید بدبخت نے نسلی عصبیت کی بنیاد پر مدینہ منورہ کی حرمت کو پامال کیا- جیسا کہ سیدہ زینب (علیہا السلام) کے ساتھ یزید ملعون نے جو مکالمہ کیا وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ یزید ملعون میں حسد، بغض اور نسلی عصبیت اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی- وگرنہ ایک امتی کی کیسے ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ (ﷺ) کے مبارک شجرے اور نسب پر طعن کرے-

اس لئے حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جے کجھ ملاحظہ سرور (ﷺ) دا کردے تاں خیمے تمبو کیوں سڑدے ھو
جیکر مندے بیعت رسولی تاں پانی کیوں بند کردے ھو

آلِ مصطفیٰ (ﷺ) کے ساتھ جو بغض ظاہر ہوا، اس کی جڑ دراصل اسی نسبت میں پیوست تھی جو انہیں رسولِ اکرم (ﷺ) سے حاصل تھی- یوں یہ محض اشخاص سے اختلاف نہ رہا بلکہ اس نسبتِ مقدس سے دوری اور انکار کی ایک شکل بن گیا- اسی طرح مدینہ منورہ، جو مرکزِ رسالت اور مظہر اسلام ہے، اس کے ساتھ روا رکھا گیا طرزِ عمل بھی اسی ذہنیت کا آئینہ دار ٹھہرتا ہے- اس تناظر میں واقعۂ کربلا اور مدینہ میں پیش آنے والے سانحات محض تاریخی واقعات نہیں بلکہ ایک اصولی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جہاں حرمتِ اہلِ

---

[9] (الصواعق المحرقه/ تفسیر مظهری/ تفسیر روح المعانی/ المعتمد الاصول)

[10] (تاریخ الخلفاء)

بیت اور تقدسِ مدینہ پامال ہو، وہاں حق کا دعویٰ خود مشکوک ہو جاتا ہے-

صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

"اَلْمَدِیْنَةُ حَرَمٌ فَمَنْ اَحْدَثَ فِیْهَا حَدَثاً اَوْ اٰوٰی مُحْدِثاً فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَ الْمَلَائِکَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ"[11]

"مدینہ حرم ہے لہٰذا جو شخص اس میں کوئی جرم کرے گا یا کسی مجرم کو پناہ دے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے"-

جو بھی مدینہ منورہ کے بارے میں بُرا سوچے تو آقا کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے حضور یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

"اَللّٰھُمَّ مَنْ اَرَادَنِیْ وَ اَھْلَ بَلَدِیْ بِسُوْءٍ فَعَجِّلْ ھَلَاکَهٗ"[12]

"اے اللہ! جو مجھ سے اور میرے شہر والوں سے برائی کا ارادہ کرے تو اسے جلد از جلد ہلاک فرمادے"-

حضرت زید بن اسلم (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ مَنْ اَرَادَ الْمَدِیْنَةَ بِسُوْءٍ فَاَذِبْهُ کَمَا یَذُوْبُ الرَّصَاصُ فِی النَّارِ اَوْ کَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَآءِ"[13]

"اے اللہ! جو مدینہ سے کسی برائی کا ارادہ کرے تو اسے ایسے پگھلا دے جیسے سیسہ آگ میں پگھلتا ہے اور جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے"-

حضرت سائب بن خلاد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ مَنْ ظَلَمَ اَھْلَ الْمَدِیْنَةِ وَ اَخَافَھُمْ فَاَخِفْھُمْ وَ عَلَیْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَ الْمَلَآئِکَتِهٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ"[14]

"اے اللہ! جس نے اہلِ مدینہ پر ظلم کیا اور انہیں ڈرایا تو تُو بھی انہیں خوفزدہ کر دے اور اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو"-

معتبر کتب اور صحیح روایات کی روشنی میں جب یہ واقعات سامنے رکھے جاتے ہیں تو سوالات خود اپنی شدت کے ساتھ ابھرتے ہیں:

- کیا مدینہ پر حملہ نہ ہوا؟
- کیا وہاں کے باشندوں پر ظلم نہ کیا گیا؟
- کیا مسجدِ نبوی کی اذان بند نہ ہوئی؟
- کیا اس کے تقدس کو مجروح نہ کیا گیا؟
- کیا اس شہر کی حرمت کو پامال نہ کیا گیا؟

یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ کے صفحات پر محض الفاظ نہیں بلکہ ایک دردناک حقیقت کے طور پر ثبت ہیں-

مدینہ، جو شہرِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے، جس کی گلیاں نسبتِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معطر ہیں، اگر اسی شہر میں ظلم کی داستان رقم ہو، تو یہ واقعہ محض ایک سیاسی حادثہ نہیں رہتا بلکہ ایک عظیم اخلاقی سانحہ بن جاتا ہے- اسی لیے احادیثِ نبویہ میں اہلِ مدینہ پر ظلم اور انہیں خوف میں مبتلا کرنے والے کے لیے سخت وعید بیان کی گئی ہے کہ ایسے شخص پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور اس کے اعمال کسی درجے میں قبول نہیں-

اسی پس منظر میں اسلاف کے اکابر آئمہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام ابن حنبل (رحمۃ اللہ علیہم) کے احوال اور اقوال واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ واقعات محض اختلافات نہیں بلکہ یزید لعین نے بغضِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں یہ مظالم ڈھائے- اس لئے سانحہ کربلا حق و باطل کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے کہ حسینؓ حق ہے اور یزید ملعون ہے-

یہی وہ مقام ہے جہاں یہ سوال اپنی پوری معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ دین کا معیار کیا ہے؟ کیا محض کسی نام یا

---

[11](صحیح مسلم، کتاب الحج)

[12](المصنف عبد الرزاق، کتاب لا شربۃ والظروف)

[13](ایضاً)

[14](معجم الکبیر)

نسبت کا دعویٰ، یا وہ اصول جن میں حرمت، عدل اور نسبتِ رسول (ﷺ) کا احترام شامل ہے؟ جب ان اصولوں کو نظر انداز کیا جائے تو محبت کے دعوے کھوکھلے محسوس ہونے لگتے ہیں اور جب محبتِ اہلِ بیت کو تعصب یا مخالفت کی بنیاد پر رد کیا جائے تو یہ رویہ خود ایک گہرے فکری بحران کی علامت بن جاتا ہے۔

سیدنا حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کا حق پر ہونا، آپؓ کی یاد کو زندہ رکھنا، آپؓ کے غم میں اشک بہانا اور آپؓ کے پیغام کو سمجھنا دراصل اسی روایت کا تسلسل ہے جسے اسلافِ امت، آئمہ دین اور مجتہدین نے اپنے عمل سے واضح کیا۔ یہ محض ایک واقعہ کی یاد نہیں بلکہ اس اصول کی پہچان ہے جس کیلئے آپؓ نے ظلم، جبر اور استبداد کے سامنے ڈٹ کر قیام کیا۔

تاریخِ امت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ جب بھی خارجی تسلط یا سامراجی قوتیں سامنے آئیں، ان کے مقابلے میں وہی طبقات سب سے زیادہ ثابت قدم نظر آئے جن کے دلوں میں روحِ دین زندہ تھی۔ سندھ میں پیر صاحب پگارو کی تحریک، لیبیا میں سنوسی تحریک، الجزائر میں امیر عبدالقادر کی جدوجہد، قفقاز میں امام شامل کی مزاحمت اور برصغیر میں فضلِ حق خیر آبادی کا فتویٰ، یہ سب اسی تسلسل کی کڑیاں ہیں جہاں دین محض عبادت نہیں بلکہ حریت، غیرت اور حق کی حفاظت کا عنوان بن جاتا ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ جب تک امت کے دلوں میں حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی محبت ایک زندہ حقیقت کے طور پر موجود رہی، وہ ظلم کے سامنے جھکنے کو تیار نہ ہوئی۔ اسی لیے مختلف ادوار میں ایسے فکری و سماجی رجحانات پیدا کیے گئے جن کا مقصد اس محبت کو محدود کرنا یا اسے کسی خاص دائرے میں مقید کرنا تھا، تاکہ امت کی اجتماعی قوت کو کمزور کیا جاسکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی ذات گرامی کسی ایک گروہ یا طبقے کی میراث نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کے مشترکہ شعور کی علامت ہے۔

اس لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) سے محبت محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک فکری اور ایمانی تقاضا ہے۔ یہ محبت قرآن کریم کے پیغام، رسول اللہ (ﷺ) کی نسبت اور دین کی روح سے جڑی ہوئی ہے۔ جب تک یہ محبت دلوں میں زندہ ہے، حق اور باطل کے درمیان امتیاز قائم رہتا ہے اور جب یہ کمزور پڑتی ہے تو فکری انتشار اور اخلاقی ابہام جنم لیتا ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مؤقف، اپنی وابستگی اور اپنی سمت کا تعین کرتا ہے۔

خواجہ اجمیر فرماتے ہیں:

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین
دین است حسین، دین پناہ است حسین
سر داد، نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

"شاہ بھی حسینؓ ہیں، بادشاہ بھی حسینؓ ہیں۔ دین بھی حسینؓ ہیں، دین کی پناہ بھی حسینؓ ہیں۔ سر دے دیا مگر اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لا الہ کی بنیاد بھی حسینؓ ہیں"۔

اسلام نے اپنے آغاز ہی سے ایک واضح اور بنیادی نعرہ عطا کیا: "لا الہ الا اللہ"۔ یہی نعرہ اپنی عملی صورت میں اس اعلان تک پہنچا کہ "لا قیصر ولا کسریٰ" نہ کوئی قیصر باقی رہے گا اور نہ کوئی کسریٰ۔ یعنی اقتدار کا وہ موروثی اور جابرانہ تصور جس میں بادشاہت نسل در نسل منتقل ہوتی ہے، اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب اقتدار کی منتقلی کے لیے ازلی بد بخت یزید لعین کا نام سامنے آیا تو اس کے جواز میں یہ استدلال پیش کیا گیا کہ جیسے سیدنا ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی حیات کے آخری ایام میں سیدنا عمر (رضی اللہ عنہ) کو نامزد کیا تھا، اسی طرح امت کو بغیر امیر کے چھوڑنا مناسب نہیں، لہٰذا یزید لعین کی نامزدگی بھی اسی اصول کا تسلسل ہے۔ مگر اس استدلال کے جواب میں سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہما) نے دوٹوک انداز میں اس فرق کو واضح کیا کہ یہ طرزِ عمل نہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کا طریق ہے اور نہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا، بلکہ یہ

تو قیصر و کسریٰ کی روش ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اقتدار سنبھالے-اسلام کا اصول اس کے برعکس ہے، جہاں قیادت نسبی وراثت نہیں بلکہ ذمہ داری اور امانت ہے-

اسی تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر اقتدار کو موروثی بادشاہت کی صورت میں قبول کر لیا جاتا تو ”لا الہ الا اللہ“ کے عملی تقاضے مجروح ہوتے اور وہی قیصریت و کسریت دوبارہ زندہ ہو جاتی جسے اسلام نے مٹایا تھا-اس لیے سیدنا حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کا مؤقف محض ایک سیاسی اختلاف نہیں بلکہ اسی اصول کی حفاظت تھا- آپؓ نے سر تو دے دیا مگر ایسے نظام کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا جو اس بنیادی اعلان کے خلاف تھا-

اس لئے محبتِ حضرت امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) کی روایت بھی اسی اصولی شعور کے ساتھ امت میں منتقل ہوئی-بر صغیر کی علمی و روحانی روایت میں خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) جیسے اکابر نے اس محبت کو ایمان، معرفت اور عمل کے ساتھ جوڑا-یہ محبت کسی ایک طبقے یا گروہ کی میراث نہیں رہی بلکہ صدیوں سے ایک مشترکہ روحانی ورثے کے طور پر زندہ رہی ہے، جہاں ذکرِ حسینؓ کو حق، وفا اور استقامت کی علامت سمجھا گیا ہے-

اس لیے یہ دعا کریں کہ:

- یا اللہ! ہمیں حضور (ﷺ) کی آل اور حضور (ﷺ) کی عترت کی محبت نصیب فرمائے
- یا اللہ! اپنے اور اپنے محبوب کریم (ﷺ) کے نور کی طرف ہماری آنکھوں سے حجابات کو ہٹا دے
- یا اللہ! اس کے بچوں کی خیر کر جو رسول اللہ (ﷺ) کے بچوں کی خیر چاہتا ہے
- یا اللہ! دنیا میں، قبر میں، آخرت میں اس کا حامی ہو جا جو رسول اللہ (ﷺ) کے بچوں کا حامی ہو گیا
- یا اللہ! ان کی مدد فرما جو آلِ محمد (ﷺ) کے مددگار ہیں-
- یا اللہ! دشمنوں کے مقابل ان کا دفاع مؤثر کر دے جو حضور (ﷺ) کے بچوں کا دفاع کرتے ہیں-
- یا اللہ! انہیں ذلیل و رسوا فرما جو ذلیل و رسوا لوگوں کو رسول اللہ (ﷺ) کے بچوں پر ترجیح دیتے ہیں-
- یا اللہ! ایسے لوگوں کو کوئی غم نہ پہنچے جنہیں حضور (ﷺ) کے بچوں کا غم ہے
- یا اللہ! ہماری ان بیٹیوں بہنوں کے سروں کی چادروں کو سلامت رکھ جنہیں چادرِ زینبؓ کا غم ہے-
- یا اللہ! ان کے درجے اور فضیلتیں بلند فرما جو رسول اللہ (ﷺ) کے اور آپؐ کی آل کے درجے اور فضیلتیں بیان کرتے ہیں-
- یا اللہ! جو سیدنا علی اصغر (رضی اللہ عنہ) کی پیاس میں تڑپتے ہیں، انہیں بروزِ حشر ساقیِ کوثر کے مبارک ہاتھوں سے سیر اب فرما-
- یا اللہ! جنہیں شبیہ رسول سیدنا امام علی اکبر (رضی اللہ عنہ) سے محبت ہے، ان کا غم رکھتے ہیں، انہیں کثیر مرتبہ شبیہ مصطفیٰ کے طفیل رخِ مصطفےٰ (ﷺ) کی زیارت نصیب فرما-
- یا اللہ! جن کے دل مودتِ آلِ محمد (ﷺ) سے روشن ہیں، دنیا میں ان کے چہروں کو روشن فرما، برزخ میں ان کی قبروں کو روشن فرما، آخرت میں ان کے انجام کو روشن فرما-
- یا اللہ! میں ان سے براءت کا اعلان کرتا ہوں جنہوں نے قتل اہل بیت پر ظالموں، غاصبوں اور آمروں سے موافقت اختیار کی-

یا اللہ! ہمیں دنیا میں بھی ان سے الگ فرما دے، برزخ میں ہماری روحیں ان سے دور رکھ اور آخرت کے دن ہمیں ان کے ساتھ حساب کے لیے کھڑا نہ کر-

- یا اللہ! جب تو رسول اللہ (ﷺ) اور آپ کی آل کے حبداروں کو کھڑا کرے تو حضور (ﷺ) اور آپ کی آل کے صدقے ہمیں حضور (ﷺ) اور آپ کی آل کے حبداروں میں کھڑا فرما-
- یا اللہ! ہمارے حال پر کرم فرما اور علم کو ہمارے لیے وبالِ جان اور گمراہی نہ بنا-ہم ایسے نہ ہو جائیں جیسے علم نے نمرودی، فرعونی اور یزیدی علماء کو کر دیا تھا-
- یا اللہ! اپنی، رسول اللہ (ﷺ) کی اور آپ کی آل کی معرفت عطا فرما-

☆☆☆

فکرِ حسینؓ کی ترویج میں صوفیائے کرام کا کردار

ڈاکٹر لئیق احمد

فکرِ حسین (رضی اللہ عنہ):

فکرِ حسین دراصل یہ ہے کہ حق ہی طاقت ہے جبکہ یزیدیت اس زعم کا نام ہے کہ طاقت ہی حق ہے- یزید لعین نے سیاست، مال اور اخلاق کو کرپشن سے آلودہ کیا- اس کے برعکس امامِ عالی مقام سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے عدل، تقویٰ اور ایثار کو جلا بخشی- یزید تخت بچا کر بھی تاریخ میں مردہ ہوا، امام حسینؓ سر کٹا کر بھی ابدی زندگی پا گئے- دنیا میں حق کے ساتھ اور باطل کے خلاف کھڑے ہونے والا ہر شخص حسینی فکر کا قائل ہے جبکہ وہ لوگ جن کے دلوں اور دماغوں پر دنیا زنار، نفس و شیطان اور ہوا و ہوس نے زنگ پھیر دیا ہے یہاں تک کہ وہ ظلم و جبر اور حق تلفی پر اتر آئے ہیں وہ یزیدی لشکر کے پیرو ہیں-

فکرِ حسین (رضی اللہ عنہ) کی ترویج:

خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے صوفیاء کرام نے فکرِ حسینؓ کے جوہر کو مشعلِ راہ بنایا- ان بزرگوں نے خانقاہوں کے ذریعے امن، انسانیت اور حق گوئی کا وہ پیغام عام کیا جس کی بنیاد نواسۂ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کربلا کے تپتے صحرا میں رکھی تھی- اصفیاء و اتقیاء کی جماعت نے امن کے ماحول میں حسینی لب و لہجے سے میدانِ عمل میں قلوب و اذہان کو تعصب، نفرت اور تمام تر بداخلاقیوں سے آزاد کرنے کی منصوبہ بندی کی اور جب میدانِ جنگ میں اترے تو حسینی تلوار اور حق کی یلغار سے دشمنوں کے مذموم مقاصد کو پاش پاش کر کے رکھ دیا-

یزید بربریت، جبر اور خیانت کا استعارہ تھا، ہے اور رہے گا مگر حسین پاک سراپا حق، انسانیت، صبر اور امانت ثابت ہوئے- کربلا کا اصل سبق ہار اور جیت کے مفہوم کی تبدیلی ہے- یہاں ظالم اپنی تمام تر خونریزی کے باوجود مٹ گیا اور مظلوم اپنی حق پرستی کی بدولت زندہ و تابندہ رہا- یزید نے معاشرے میں سیاسی، معاشی، مذہبی و اخلاقی بگاڑ پیدا کیا جسے مٹانے کے لیے خانوادۂ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا- اسی فکرِ حسین کے ساتھ صوفیاء کرام رحمہم اللہ اجمعین نے اقتدار کی بندگی کے بجائے مساواتِ ایمانی کا درس دیا- فکرِ حسینؓ کی ترویج میں صوفی بزرگان کا کردار اسی ابدی سچائی کو نسل در نسل منتقل کرتا چلے آرہا ہے- آئیں تاریخ کے دریچوں سے جانیں کہ میدانِ تصوف کے شہسواروں نے کس طرح کربلا کے میدان کے شہسواروں کی ریت کو اپنایا اور اپنے قول و فعل سے فکرِ حسینؓ کی ترویج و تبلیغ کی-

صوفیاء کرام (رحمۃ اللہ علیہم) کے حسینی فکر سے مزین کردار:

اسلام کی تاریخ میں پیغامِ الٰہی کی حفاظت اور اسے نسلِ نو تک منتقل کرنے میں جماعتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے بعد تابعین و تبع تابعین، علماء و مشائخ، فقہاء و محدثین و صاحبانِ تصوف کا کردار نہایت کلیدی رہا ہے- امام حسین پاکؓ نے کربلا کے میدان میں جس عادلانہ نظام، ظلم کے خلاف انکار اور انسانی وقار کی بحالی کا علم بلند کیا تھا، صوفیاء کرام نے اسی فکرِ حسینی کو خانقاہوں سے نکال کر سماج کے پسے ہوئے طبقات تک پہنچایا- ان نفوسِ قدسیہ نے نہ صرف روحانی تربیت کی بلکہ اسلام کے

معاشی اور سیاسی نظام کو ملوکیت کے جبر کے خلاف ایک ڈھال بنا کر پیش کیا۔

فکرِ حسینؓ اور داتا علی ہجویریؒ (المتوفی:465ھ)

حضرت سید علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ نسبی اور فکری دونوں اعتبار سے خانوادۂ اہلِ بیت کے چشم

وچراغ اور فکرِ حسینی کے عظیم علمبردار ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے امام حسنؓ اور بالواسطہ امام حسینؓ سے ملتا ہے، جس کے اثرات آپ کی زندگی، زہد و تقویٰ اور تبلیغِ دین میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ امام حسین پاکؓ نے کربلا کے میدان میں جس عادلانہ نظام اور حق کی سربلندی کا عملی نمونہ پیش کیا، داتا گنج بخشؒ نے اسے برصغیر میں اپنی علمی تصنیفات بشمول کشف المحجوب اور عملی کردار کے ذریعے دوام بخشا۔ آپؒ کی گفتگو کے ہر پہلو میں رضائے الٰہی اور عقائد و اعمال کی اصلاح کے جو پھول مہکتے ہیں وہ دراصل اسی حسینی گلشن کی خوشبو ہے جس نے ملوکیت کے اثرات کو زائل کر کے دلوں میں عشقِ رسول (ﷺ)، ادب و محبتِ اہلِ بیتِ اطہار اور حریتِ ایمانی کی شمع روشن کی۔ جس طرح امام حسینؓ نے ظاہری اقتدار کے مقابلے میں اصولوں کی پاسداری کو ترجیح دی، اسی طرح سید علی ہجویریؒ نے صوفیاء کے مروجہ لبادوں اور محض ظاہری شعار کے بجائے خودداری، عاجزی اور اخلاقِ حمیدہ کو تصوف کی بنیاد قرار دیا۔ آپؒ درویشوں کو دنیا دار (جس کا دل رغبتِ دنیا سے معمور ہو گیا ہو) کی صحبت سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں جو درحقیقت اسی حسینی استغناء کا پرتو ہے جو کسی جابر یا مادی قوت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتا ہے۔

فکرِ حسینؓ اور امام غزالیؒ (المتوفی:505ھ)

حجت الاسلام امام ابو حامد محمد غزالیؒ کی علمی و اصلاحی تحریک دراصل اس "فکرِ حسینیؓ" کا فکری تسلسل ہے جس کا مقصد شریعت کی ظاہری روح کو باطنی طہارت اور اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ امام غزالیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف احیاء العلوم میں جس تزکیہ نفس اور اخلاقی انقلاب پر زور دیا، اس کا سرچشمہ وہی حسینیت ہے جو باطل کے سامنے سر جھکانے کے بجائے حق کی خاطر جان کی قربانی کو ترجیح دیتی ہے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک دین محض فقہی موشگافیوں کا نام نہیں بلکہ یہ اس باطنی طہارت کا عنوان ہے جو انسان کو ملوکیت اور یزیدیت کے اثرات سے پاک کر کے بندگیِ رب کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے۔ آپ نے یونانی فلسفے کے خشک عقلی غلبے کے سامنے اس "عشقِ الٰہی" اور "استقامت" کی شمع روشن کی جو سید الشہداء کا خاصہ تھی۔ امام حسینؓ کے قاتلان اور یزید کے بارے میں امام غزالیؒ کا مؤقف ان کے کمالِ تقویٰ اور عدل پر مبنی ہے۔ انہوں نے یزید کے کردار کی مذمت کرتے ہوئے واضح کیا کہ سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا قتل سراسر ظلم اور ناحق تھا جس نے حریتِ فکر کے حلق میں زہر انڈیلنے کی سعیِ بد کی۔ امام غزالیؒ نے جدید دور کے یزیدی حمایتیوں کے برعکس، معرکہ کربلا کو کسی سیاسی جنگ کے بجائے حق و باطل کا ابدی معیار قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ "تلقینِ غزالی" دراصل "فلسفۂ حسینؓ" کی ہی وہ علمی شرح ہے جو امت کو جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے اور شریعت و تصوف میں توازن برقرار رکھنے کا درس دیتی ہے۔

فکرِ حسینؓ اور سیدنا غوث الاعظم دستگیرؒ (المتوفی:561ھ)

سیدنا غوث الاعظم حضرت عبد القادر جیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا شجرہ نسب والد کی طرف سے نواسۂ رسول، خلیفۃ الاسلام سیدنا حضرت امام حسنؓ اور والدہ کی طرف سے سید الشہداء امام

عالی مقام حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے، جس سے آپ حسنی و حسینی سید بنتے ہیں- آپؒ نے امت کی کامل تربیت کر کے ان میں فکری و عسکری لحاظ سے فکرِ حسینی کا احیاء فرمایا- آپ نے امام عالی مقام سیدنا امام حسین پاکؓ کے اسوۂ مبارک کی روشنی میں حق کی بالادستی اور نفس کی تطہیر کو اپنا مشن بنایا- آپ نے ایک ایسی علمی چھاؤنی بنائی جہاں سے باطل نظریات اور ظالم حکمرانوں کے خلاف فکری مزاحمت پیدا کی گئی- مؤرخین کہتے ہیں کہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے مدارس اور خانقاہوں کے ذریعے ایک ایسی ہمہ گیر اصلاحی تحریک چلائی جس نے ملوکیت کے اثرات کو زائل کر کے حریتِ ایمانی کو زندہ کیا جو کہ عین روحِ حسینی ہے-[1]

فکرِ حسینؓ کی ایک بنیادی جہت استغناء اور جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے- سیدنا غوثِ پاکؒ کے دربار میں وقت کے خلفاء اور سلاطین جب دنیوی جاہ و حشم کے ساتھ حاضر ہوتے تو آپ کا رویہ ان کے ساتھ ایک ناصحِ مشفق مگر نہایت جری مصلح کا ہوتا- امام الشطنوفی ”بہجۃ الاسرار“ میں رقم طراز ہیں کہ جب خلیفہ المستنجد باللہ نے اشرفیوں کی تھیلیاں پیش کیں تو آپ نے انہیں نچوڑ کر ان سے مظلوموں کا خون ٹپکا کر دکھا دیا- یہ واقعہ دراصل اس حسینیؓ فکر کی علامت ہے کہ ظلم کے مال سے کبھی روحانیت کی آبیاری نہیں ہو سکتی-[2]

شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے بغداد میں جس مدرسے کی بنیاد رکھی، وہ فقہ و حدیث کے مرکز کے ساتھ ساتھ حطین اور بیت المقدس کی فتح کا پہلا زینہ تھا- آپ کے اس مدرسے میں زیرِ تربیت علماء نے جہاں عوام کے عقائد کی اصلاح کی وہیں وقت پڑنے پر وہ مجاہدینِ حریت بن کر جو میدانِ جنگ میں باطل سے بھی ٹکرائے- سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتوحاتِ اسلامیہ کا باب تاریخِ عالم کا وہ درخشندہ ورق ہے جس کے باطنی اسباب سے بہت کم لوگ واقف ہیں- حقیقتِ حال یہ ہے کہ معرکۂ بیت المقدس میں جس لشکری قوت نے فتح کا علم بلند کیا، اس کی اکثریت حضور غوثِ اعظم سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ کے مدرسہ عالیہ کے فیض یافتہ تلامذہ اور مریدین پر مشتمل تھی- یہ مجاہدینِ صف شکن محض عسکری مہارت کے حامل نہ تھے بلکہ شب بیدار زاہد اور تقویٰ کے اس مرتبے پر فائز تھے کہ گویا ایک پوری خانقاہ میدانِ کارزار میں اتر آئی تھی- تاریخی شواہد اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایوبی فوج کا نصف سے زائد حصہ غوثِ اعظم کے مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ پر مبنی تھا، جبکہ بقیہ دستوں میں امام غزالی کے مدرسہ نظامیہ کے فیض یافتگان شامل تھے- مزید بر آں، سلطانِ وقت کے معتمدِ خاص اور چیف ایڈوائزر، امام ابن قدامہ المقدسی الحنبلی بذاتِ خود ایک جلیل القدر فقیہ اور محدث تھے، حضور غوثِ پاک کے براہِ راست شاگرد اور خلیفہ تھے- ان کے ہمراہ ان کے برادرِ نسبتی امام عبد الغنی المقدسی الحنبلی بھی اسی روحانی و علمی شجرے سے وابستہ تھے-

معاصر مؤرخین کے مطابق نور الدین زنگی کے قادریہ سلسلے کے مشائخ سے گہرے مراسم تھے اور وہ غوث الاعظم کے لائے ہوئے اصلاحی منشور کو اپنی ریاست میں نافذ کرتے تھے- بیت المقدس کی فتح محض ایک عسکری کامیابی نہ تھی بلکہ یہ اس فکرِ حسینی کی جیت تھی جس نے مصلحت کو ٹھکرا کر حق

[1] (ہکذا ظہر جیل صلاح الدین وہکذا عادت القدس، اردو ترجمہ: صلاح الدین ایوبی کی نسل کیسے تیار ہوئی)

[2] (امام ابو الحسن الشطنوفی، بہجۃ الاسرار، ص: 171)

کے لیے قیام کرنا سکھایا- شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے امت کو وہ فقرِ غیور عطا کیا جس نے صدیوں سے چھینی ہوئی آزادی کو دوبارہ مسلمانوں کا مقدر بنادیا-[3]

آپ قدس اللہ سرہ کی تصنیفات بشمول الفتح الربانی، فتوح الغیب، سر الاسرار شریف سب تعلیماتِ حق کا پیش خیمہ ہیں جو علوم و عرفانِ سیدنا حسین پاکؓ کا منبع ہیں-

فکرِ حسینؓ اور حضرت معین الدین چشتیؒ (المتوفی:633ھ)

ہندوستان کی سر زمین پر فکرِ حسینی کے اولین علم برداروں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے- 1166ء میں جب آپ اجمیر تشریف لائے تو یہاں کا معاشرہ طبقاتی تقسیم اور اچھوت پن کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا- آپ نے امام عالی مقام کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے مظلوم طبقات کو گلے لگایا اور انہیں اسلام کے عادلانہ نظام سے متعارف کروایا- آپ کی دعا کے نتیجے میں رائے پتھور کی گرفتاری اور جابر اقتدار کا خاتمہ دراصل اسی حسینی اصول کی عملی تفسیر تھی کہ ”حق آگیا اور باطل مٹ گیا“-

فکرِ حسینؓ اور حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ (المتوفی:661ھ)

ملتان اور سندھ کے خطے میں حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے نہ صرف قرامطہ جیسے گمراہ فرقوں کا قلع قمع کیا بلکہ زراعت، تجارت اور نہروں کی تعمیر کے ذریعے ایک خوشحال اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی- آپ کا سیاسی ذوق بھی حسینی بصیرت کا حامل تھا- جب منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کیا تو آپ نے اپنی جیب سے خطیر رقم ادا کر کے انسانی خون بہنے سے بچایا- آپ نے ثابت کیا کہ ولی اللہ وہی ہے جو وقت پڑنے پر عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ڈھال بن جائے-

فکرِ حسینؓ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ (المتوفی:664ھ)

سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے پاکپتن (اجودھن) کو فیضانِ حسینی کا مرکز بنایا- آپ کی زندگی اس حسینی فقر کا نمونہ تھی جو مادی جاہ و جلال کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتی ہے- جب سلطان ناصر الدین محمود نے جاگیر اور نقد رقم پیش کی تو آپ نے اسے مسترد کر کے ثابت کر دیا کہ صوفی ملوکیت کا کاسہ لیس نہیں بلکہ حق کا نقیب ہوتا ہے- آپ کے اخلاق اور انسان دوستی کی بدولت پنجاب کے بڑے قبائل نے اسلام کے عادلانہ نظام میں پناہ لی جو کہ فکرِ شبیری کی خوشبو کا ہی تسلسل تھا-

فکرِ حسینؓ اور مولانا رومیؒ (المتوفی:672ھ)

مولانا جلال الدین رومی کی صوفیانہ فکر میں معرکۂ کربلا روح کے سفر کی ایک عظیم تمثیل اور نفسِ امارہ کے خلاف جہادِ مسلسل کا استعارہ ہے- رومی کے نزدیک خرقۂ درویشی دراصل انھی نجیب الطرفین نسبتوں کا مجموعہ ہے جو ائمۂ اہل بیت کی دہلیز سے پھوٹتی ہیں- مولانا رومی اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ جو بھی ان کی فکر اور پیغام سے وابستہ ہے وہ حسنین کریمین کے اسوہ سے مستغنی نہیں ہو سکتا-

مولانا رومی عشق کی معراج اور انتہائے منزل کربلا کو قرار دیتے ہیں- ان کی نظر میں سچا عاشق وہ ہے جو موت کے خوف سے آزاد ہو کر میدانِ فنا میں رقص کرے کیونکہ شہید کبھی موت سے نہیں ڈرتا بلکہ وہ تو بقائے دوام کا طالب ہوتا ہے- دیوانِ شمس تبریزی میں وہ اہل حقوق اور اہل پارسائی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تم محض ظاہری عبادات اور مصلحت پسندی کے حصار میں مقید رہے تو کبھی کربلا کی اس حقیقت کو نہیں پاسکو گے جہاں جان کا نذرانہ پیش کر کے حق کو زندہ کیا جاتا ہے- مولانا رومی فرماتے ہیں:

[3] (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد اول، ذکر شیخ عبد القادر جیلانیؒ)

کاین شهیدان ز مرگ نشکیبند
عاشقانند برفنا بودن
شششه می گیر و روز عاشورا
تو نتانی به کربلا بودن

”یہ شہید موت سے نہیں گھبراتے، کیونکہ وہ فنا میں بقا پانے والے عاشق ہوتے ہیں- ہوش سنبھال اور سمجھ لے کہ روزِ عاشوراہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ کربلا والا بن سکے“-

فکرِ حسینؓ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ (المتوفی:725ھ)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی میں بیٹھ کر اشاعتِ اسلام کا وہ جال بچھایا جس نے بنگال سے دکن تک انسانیت کو فیض پہنچایا- ان کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی فکری بصیرت کا عالم یہ تھا کہ جب وزیرِ مملکت نے عبادت کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری عبادت حاجت مندوں کی حاجت روائی ہے-یعنی فرائض و عبادات کی پابندی کے ساتھ حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی عظیم عبادت ہے، کیونکہ مخلوقِ خدا کی خدمت شریعتِ مطہرہ کی روح اور

رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے- یہ وہی فکر ہے جو امام حسینؓ نے سکھائی کہ دین فقط تسبیح و مناجات نہیں بلکہ انسانی حقوق کی پاسداری اور سماجی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا نام ہے-

فکرِ حسینؓ اور سلطان حق باھوؒ (المتوفی:1102ھ)

سلطان العارفین حضرت سلطان باھوؒ قبیلۂ اعوان سے ہیں جو سادات کے معاون و مددگار و جاں نثار ہیں- سلطان حق باھُو کی تعلیمات میں امام عالی مقام سیدنا حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) کی ذاتِ اقدس وہ پیمانہ ہے جس پر علم اور عمل کی سچائی کو پرکھا جاتا ہے- آپؒ کے نزدیک دین حق کیلئے ڈٹ جانے اور جان کا نذرانہ پیش کر دینے کا نام ہے- آپؒ اس عظیم فلسفے کو اپنے عارفانہ کلام میں بیان فرماتے ہیں کہ اگر دین محض ظاہری علم میں ہوتا تو امام حسین کا سرِ انور نیزے پر بلند نہ ہوتا- آپؒ کے نزدیک اٹھارہ ہزار عالموں کی موجودگی میں امام حسین کی قربانی یہ ثابت کرتی ہے کہ حقیقی علم وہی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ لٹا دینے کا حوصلہ دے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جے کر دین علم وچ ہوندا تاں سر نیزے کیوں چڑھدے ھو
اٹھارہ ہزار جو عالم آہا اوہ اگے حسینؓ دے مردے ھو
جے کجھ ملاحظہ سرور (ﷺ) دا کردے تاں خیمے تمبو کیوں سڑدے ھو
جیکر مندے بیعت رسولی تاں پانی کیوں بند کردے ھو
پر صادق دین تنہاں دے باھوؒ جو سر قربانی کردے ھو

حضرت سلطان باھوؒ اپنے ابیات میں جابجا ان 'علمائے سُوء' کا سخت محاسبہ کرتے ہیں جنہوں نے یزیدی درباروں سے وابستہ ہو کر دین کو اپنی معیشت اور دنیاوی مراعات کا ذریعہ بنا لیا تھا- آپؒ کے اشارے واضح طور پر ان علماء کی طرف ہیں جنہوں نے مال و دولت کی ہوس میں عترتِ رسول (ﷺ) سے اعتصام ترک کر دیا تھا- آپؒ فرماتے ہیں کہ ایسا علم جو بادشاہوں اور حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے ہو وہ ہرگز خیر کا چشمہ نہیں بن سکتا بلکہ اس سے تفرقہ اور نفرت ہی جنم لیتی ہے- آپؒ نے ان علماء کو پھٹے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی جس سے مکھن نہیں نکل سکتا-

پڑھ پڑھ علم ملوک رِجھاون کیا ہویا اُس پڑھیاں ھو
ہرگز مکھن مُول نہ آوے پھٹے دُودھ دے کڑھیاں ھو

آپؒ مزید فرماتے ہیں کہ ان دنیا پرست علماء کا مطمحِ نظر معرفتِ حق نہیں بلکہ فیسیں اور ویلیں ہیں-

جتھے ویلھن چنگا چوکھا اُتھے پڑھن کلام سوائی ھو

سلطان العارفینؒ کے نزدیک ساداتِ کرام کی محبت و تعظیم ایمان کا جزوِ لاینفک اور معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے- آپ اپنی تصنیف نور الھدیٰ میں صراحت کے

ساتھ لکھتے ہیں کہ سادات کا دشمن دراصل حضور نبی کریم (ﷺ) اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے جبکہ ان کا دوست جنتی اور سنتِ نبوی کا حقیقی پیروکار ہے- آپؒ کے نزدیک جو شخص آلِ نبی (ﷺ) اور اولادِ علی و فاطمہ کا منکر ہے وہ زندگی بھر ریاضت کے پتھر سے سر پھوڑتا رہے لیکن کبھی معرفتِ الٰہی نہیں پا سکتا- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نور الھدیٰ شریف میں لکھتے ہیں:

دشمنِ سادات دشمنِ مصطفیٰؐ
ہر کہ دشمن مصطفیٰؐ دشمن خدا

"سادات کا دشمن مصطفیٰ (ﷺ) کا دشمن ہے اور مصطفیٰ (ﷺ) کا دشمن اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے"-

دشمنِ سیّد بود اہل از بلشت
دوست دارِ سیّداں اہل از بہشت

"سادات کا دشمن جہنمی ہے اور سادات کا دوست جنتی ہے"-

ایک اور مقام پہ لکھتے ہیں:

دشمنِ سیّد بود اہل از خبیث
دوست دارِ سیّد اں اہل از حدیث

"سادات کا دشمن خبیث ہے اور سادات کا دوست سنت کی پیروی کرنے والا ہے"-

حضرت سلطان باھوؒ ساداتِ کرام کو بارگاہِ خداوندی سے عطاکردہ عزت و شرف کا وارث قرار دیتے ہیں اور ان کی دشمنی کو ہوا پرستی سے تعبیر کرتے ہیں- آپؒ کی پوری زندگی اور کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ آپ سادات کو نبی (ﷺ) کا نور اور سیدہ فاطمہؓ و حضرت علیؓ کی آنکھوں کی ٹھنڈک سمجھتے تھے- آپؒ کی فکرِ حسین سے وابستگی ان اشعار سے عیاں ہے-

دوست دارم سیّداں نورِ نبیؐ
نور دیدۂ فاطمہ حضرت علی

"مَیں سادات سے دوستی رکھتا ہوں کہ وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور ہیں اور حضرت علی اور حضرت فاطمۃ الزہرہ (رضی اللہ عنہما) کے نورِ نظر ہیں"-

سیّداں را عزّت و شرف از خدا
دشمنِ سیّد بود اہل از ہوا

"بارگاہِ خداوندی سے سادات کو شرف و عزت سے نوازا گیا ہے، سادات کا دشمن کوئی ہوا پرست ہی ہو سکتا ہے"-(اہل ایمان نہیں)

حضرت سلطان باھوؒ نے یزیدی علماء کے مقابلے میں امام حسین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حق، سچائی اور قربانی کے اس آفاقی شعور کو عام کیا جو کسی مصلحت یا مادی لالچ کا اسیر نہیں ہوتا- المختصر یہ کہ سلطان العارفین نے کم و بیش 140 تصانیف مرقوم فرمائیں جن میں سے آج جتنی منظرِ عام پر ہیں، ان سب کا مطالعہ کیا جائے تو روزِ روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ آپؒ نے فکرِ حسین کی ترویج کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا-

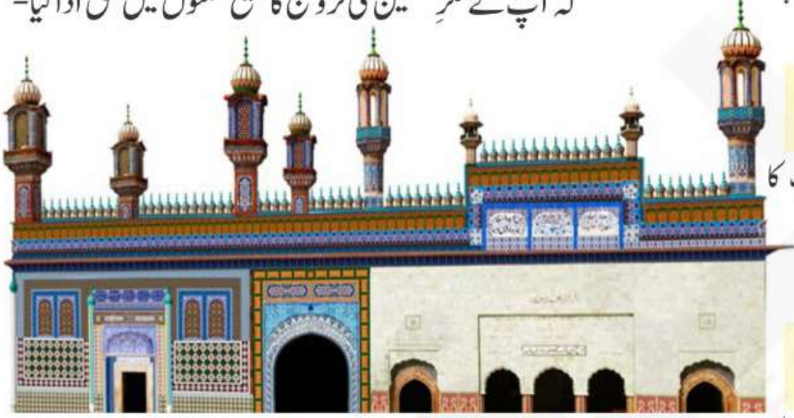

فکرِ حسینؓ اور حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ (المتوفی:1165ھ)

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی صوفیانہ شاعری میں معرکۂ کربلا حق و باطل کے ابدی ٹکراؤ اور رضا کے فلسفے کا عکاس ہے- شاہ صاحب نے اپنے کلام میں پورا ایک "سر" (باب) جس کا نام "کیڈارو" (میدانِ جنگ) رکھا ہے، شہدائے کربلا اور امام عالی مقام کی جرات و استقامت کیلئے وقف کیا ہے- آپؒ کے نزدیک محرم الحرام کا چاند سادات کے شہزادوں کے لیے اس عظیم آزمائش کے استقبال کا پیغام لاتا ہے جس کا فیصلہ روزِ ازل سے اللہ کی رضا میں ہو چکا تھا- شاہ صاحب ان شہزادوں کے عزم کو یوں بیان کرتے ہیں-

ڏٺو محرّم ماھ، ٿئو سنڪو شھزادن ۾،
جاڻي ھيڪ اُلله، پاڻ وٽنديون جو ڪري

"جب ماہِ محرم آیا تو شہزادوں کے دلوں میں اضطراب پیدا ہوا، اور وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے گا، وہی ہو گا"-

آپؒ کے نزدیک یہ میدانِ جنگ دراصل میدانِ عشق تھا جہاں سادات کے شیروں نے بھوک، پیاس اور کوفیوں کی بے وفائی کے باوجود اللہ کی رضا کو ہر شے پر مقدم رکھا- شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ محرم تو واپس آ گیا مگر مدینے کے وہ سردار واپس نہ آئے جن کی یاد میں مکہ اور مدینہ آج بھی سوگوار ہیں- شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے ’’سر کیڈارو‘‘ میں سادات کی شجاعت اور یزیدی لشکر کے سامنے ان کے بے مثال جوہرِ جرأت کو نہایت پر زور انداز میں بیان کیا ہے- آپؒ کے نزدیک کربلا کے میدان میں اہل بیت کی آمد ایسی تھی جیسے شیر اپنی کچھار سے نکل کر باطل کو للکار رہے ہوں- جب سادات نے کربلا میں خیمے نصب کیے تو انہوں نے تلواروں کی تاب دیکھ کر پیٹھ نہیں موڑی بلکہ تقدیر کے اٹل فیصلے کو مسکراتے ہوئے قبول کیا- شاہ صاحب اس منظر کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

ڪربلا جي پڙ ۾، مرڪي آيا مير
وڙهي ويرن سامهان، تکا هنيائون تير
هئي ايءَ تقدير، اصل امامن سين

’’کربلا کے میدان میں سرفروش بہادری سے کھڑے تھے- دشمنوں کے مقابل ڈٹ کر لڑے اور تیز تیر برسائے- یہی تقدیر ابتدا ہی سے اماموں کے ساتھ وابستہ تھی‘‘-

حضرت مخدوم جہانیاںؒ اور شیخ رکن الدینؒ

سلطان محمد بن تغلق کے غیظ و غضب سے اہلِ ملتان کو بچانے کیلئے حضرت شیخ رکن الدینؒ کا ننگے پاؤں سلطان کے دربار میں جانا اس جراتِ رندانہ کی یاد دلاتا ہے جو کربلا کا خاصہ ہے- اسی طرح حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا فیروز شاہ تغلق کو عوامی حاجات کی فہرست تھمانا اس بات کی دلیل ہے کہ صوفیاء نے ہمیشہ بادشاہوں کے سامنے عوامی مفادات کی ترجمانی کی اور اقتدار کو انسانیت کی خدمت کیلئے استعمال کرنے پر مجبور کیا-

فکرِ حسینؓ اور علامہ محمد اقبال (المتوفی:1357ھ)

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی فکر کا اساسی محور حرکت، حرارت اور تسلسلِ ارتقاء ہے- اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا کمال اس میں ہے کہ وہ کائناتی مقاصد کی تکمیل میں خالق کا دست و بازو بن جائے اور یہ تبھی ممکن ہے جب انسان حق و صداقت کی آفاقی اقدار کے احیاء کے لیے باطل کے سامنے صف آرا ہو جائے- اقبال کے نزدیک اسلام کی اصل روح ’’رسمِ شبیری‘‘ کی ادائیگی میں پنہاں ہے جو ایک دائمی طرزِ حیات ہے- اقبال معرکہ کربلا کو کسی سیاسی یا خاندانی جنگ کے طور پر بیان نہیں کرتے ہیں، ان کے ہاں یہ ’’عقل‘‘ اور ’’عشق‘‘ کے ابدی معرکے کا عنوان قرار پایا ہے- ان کے نزدیک امام عالی مقامؓ ’’امام عاشقان‘‘ ہیں جنہوں نے عقلِ مصلحت اندیش کے برعکس عشقِ الٰہی کے تقاضوں کو پورا کیا- عقل جہاں اپنے مفاد اور بقاء کی فکر میں رہتی ہے وہیں عشق اپنی آزمائش اور قربانی سے حیاتِ نو تخلیق کرتا ہے- اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام کی پوری عمارت اسی عشقِ حسینی سے عبارت ہے جس نے حق کو باطل سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا-

عقل می گوید که خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن
آن امامِ عاشقان پور بتول
سرو آزادے ز بستانِ رسول
سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی این مصرع از مضمون او

’’عقل کہتی ہے کہ پہلے اپنے آپ کو محفوظ کر، مگر عشق کہتا ہے کہ خود کو آزمائش میں ڈال- وہ امام عاشقاں، سیدۂ بتولؓ کے لعل، رسولؐ کے گلشن کا آزاد و سربلند سرو

تھے- عشقِ غیرت مند اُن کے خون سے سرخ رو ہوا اور اس شعر کی شوخی بھی اُنہی کے مضمون سے ہے"-

اقبال کی نگاہ میں مقامِ شبیری، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کے اس اجمالی خواب کی مفصل تعبیر ہے جسے قرآن مجید نے "ذبحِ عظیم" سے تعبیر کیا- امام حسین پاکؓ نے اپنے خون سے اس شجرِ اسلام کی آبیاری کی جسے ملوکیت اور استبداد کے زہر نے مرجھا دیا تھا- اقبال کے نزدیک امام حسین خلافتِ راشدہ کی ان اقدار کے محافظ تھے جن کا رشتہ قرآن کریم سے ٹوٹ چکا تھا- امام حسینؓ کی تکبیر نے نہ صرف اس وقت کی ملتِ خوابیدہ کو بیدار کیا بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے حریت اور آزادی کا ایک نیا باب روشن کر دیا-

سر ابراہیم و اسمعیل بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود
اللّٰہ اللّٰہ بائے بسم اللّٰہ پدر
معنی ذبحِ عظیم آمد پسر
در میان اُمت آں کیواں جناب
ہمچو حرفِ قل ھو اللّٰہ در کتاب

"وہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے راز کا مظہر تھے، یعنی جو حقیقت اجمال میں تھی، وہ اُن میں تفصیل بن کر ظاہر ہوئی- سبحان اللہ! باپ گویا بسم اللہ کی "باء" تھا، اور بیٹا "ذبحِ عظیم" کے معنی کا کامل ظہور امت کے درمیان وہ بلند مرتبہ ہستی ایسی تھی، جیسے قرآن میں سورۂ "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ" کا مقام"-

اقبال کے ہاں فقر کے مختلف درجے ہیں لیکن "فقرِ شبیری" وہ کیمیا ہے جو انسان میں مٹی کو سونا کر دینے کی خاصیت پیدا کر دیتا ہے- وہ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو خانقاہوں کی بے عملی سے نکل کر میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسے حیاتِ ابدی کا راز قرار دیتے ہیں- اقبال کے کلام میں امام حسینؓ کا ذکر اس عزمِ مصمم کے حصول کے لیے ہے جو کسی فرعون کے سامنے سر نہیں جھکاتا- ان کا پیغام یہ ہے کہ اگر امت اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنا چاہتی ہے تو اسے پھر سے کوفہ و شام کی فضاؤں میں خونِ حسینؓ سے شادابی پیدا کرنی ہوگی-

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

حرفِ آخر:

صوفیاء کرام کی زندگیوں، ان کے اعمال اور ان کی تعلیمات بلاشبہ فکرِ حسین (رضی اللہ عنہ) کی عملی ترویج تھیں جو آج کے انسان کو بھی وہی جرأت، بہادری، حق گوئی و بیباکی کا درس دیتی ہیں جسے امام عالی مقام، سید الشہداء سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے دیا- اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ہمیں سچا حسینی بنائے- آمین!

☆☆☆

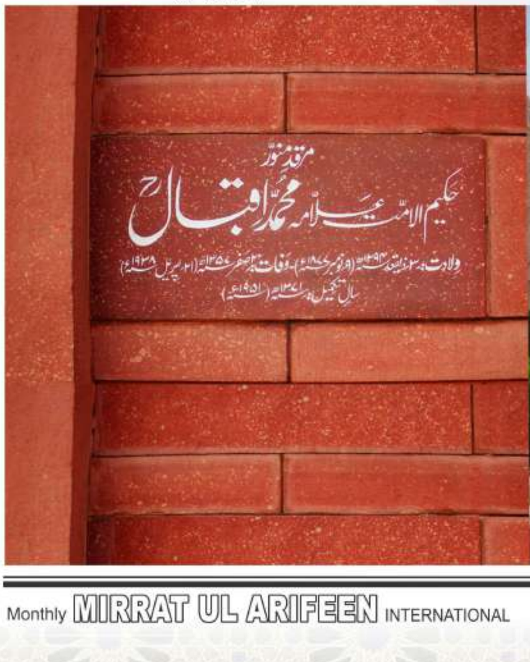

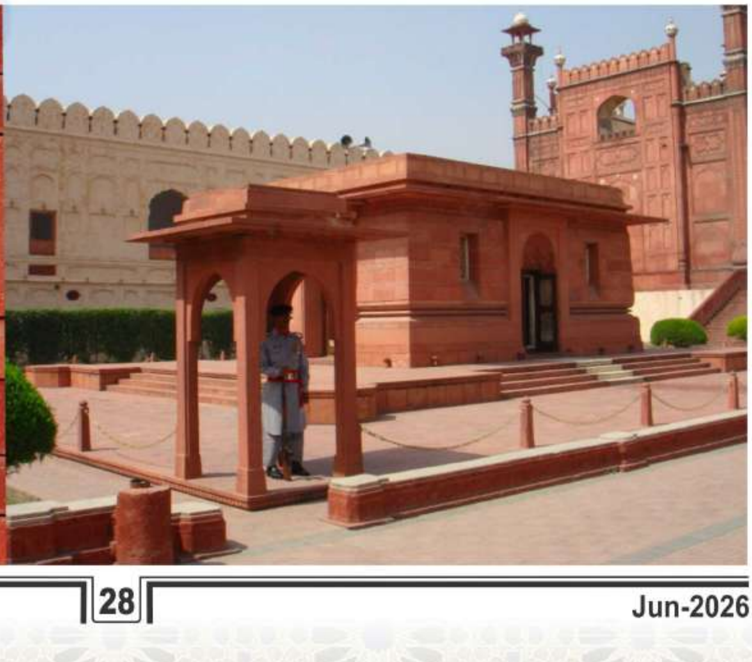

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

اور عصرِ حاضر کے سماجی و اخلاقی بحران

ڈاکٹر عبد الباسط
(بحریہ یونیورسٹی، اسلام آباد)

عصرِ حاضر کا معاشرہ کثیر الجہتی بحرانوں سے دوچار ہے جن میں اخلاقی زوال، سیاسی عدم استحکام، معلوماتی انتشار، معاشی ناہمواری اور نظامِ تعلیم کی کمزوریاں نمایاں ہیں۔ یہ بحران محض انتظامی یا تکنیکی نہیں بلکہ بنیادی طور پر اخلاقی، فکری، سماجی، معاشی اور معاشرتی نوعیت کے ہیں۔ انسانی تاریخ میں کچھ واقعات وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور وہ صرف ماضی کا حصہ نہیں رہتے بلکہ ہر دور کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی جدوجہد ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیتی ہے جس میں مزاحمت، اخلاق اور شعور ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ جب تاریخ، کربلا کے صحرا میں رُکتی ہے تو وقت تھم جاتا ہے لیکن اس واقعہ کی گونج صدیوں کا سفر طے کر کے آج کے دور تک پہنچتی ہے۔ یہ محض تلواروں کی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک بیانیے کی جنگ تھی۔ اگر ایک طرف طاقت کا بیانیہ تھا تو دوسری طرف اذانِ حق کا پرچار کرنے والے جانثار۔ اِس واقعہ نے حق و باطل میں واضح فرق کی وہ لکیر کھینچی، جو قیامت تک قائم رہے گی۔

آج کا نوجوان بھی سچ اور جھوٹ، انصاف اور مفاد، شعور اور بے حسی کے بیانیوں کے درمیان کھڑا ہے، جہاں حسینؓ فکر اس کیلئے ایک واضح راستہ متعین کرتی ہے۔ سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے سن 61ھ میں مقام کربلا پر دُنیا اور لوگوں کے حالات کے بارے میں فرمایا:

”جو معاملہ درپیش ہے تم اسے دیکھ رہے ہو اور بیشک دُنیا تبدیل ہو گئی ہے جو کہ اچھی حالت سے نکل کر بُری حالت کی طرف چلی گئی ہے اور دُنیا سے اچھائی نے پیٹھ پھیرلی ہے“۔

بوقت واقعۂ کربلا محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رُخصت ہوئے ابھی 50 سال ہوئے تھے، جبکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے براہ راست فیضیاب ہونے والے بزرگ صحابہ بھی اُس وقت موجود تھے جن سے لوگ رہنمائی لے سکتے تھے۔ لیکن دُنیا کی رنگینیوں نے ایسا جادو چلایا کہ خاندانِ نبوت کا مقام و مرتبہ بھی بھول گئے۔[1] مقام کربلا پر جو امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور اُن کے رُفقاء کے ساتھ کیا گیا، تاریخ نے اس سے بدتر ظلم زمین پہ نہیں دیکھا۔

فِکرِ حسینؓ، بنیادی طور پر ایک جامع اخلاقی اور سماجی نظریہ ہے جو عصرِ حاضر کے متعدد ساختی بحرانوں کا تجزیاتی مطالعہ فراہم کرتی ہے۔ یہ تحقیق درج ذیل تین بنیادی نظریاتی ستونوں (Framework) پر قائم ہے۔ جن میں اخلاقی مطلقیت (Moral Absolutism) اخلاقی مزاحمت (Ethical Resistance Theory) اور اصولی قیادت (Principled Leadership Model) شامل ہیں۔ یہ فریم ورک اس مفروضے پر مبنی ہے کہ دورِ جدید کے مسائل کو محض سیاسی یا معاشی وجوہات کے تناظر میں نہ دیکھا جائے، بلکہ

[1] اسماعیل خان نیازی، مفتی محمد، (جولائی، 2024ء)، ”سید الشہداء حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے خطوط و خطبات کا اجمالی جائزہ، مشمولہ، ”مرآۃ العارفین انٹرنیشنل“

اِنہیں اِخلاقی اور فِکری انحطاط و انحراف کے زاویے سے بھی پر کھا جائے۔

1-اخلاقی مطلقیت (Moral Absolutism)

اخلاقی مطلقیت سے مراد وہ نظریہ ہے جس کے مطابق بعض اخلاقی اقدار جیسے عدل، حق، سچائی اور دیانت کسی مخصوص وقت، حالات یا معاشرے کے تابع نہیں، بلکہ یہ وقت کی قید سے آزاد آفاقی (universal) حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اخلاقی اقدار کا جائزہ فِکر حسینؑ سے لیا جائے تو تحقیق (آپؑ کے خطوط) سے پتا چلتا ہے کہ، سید الشہداء امام حسینؑ نے یزید کی بداعمالیوں اور اخلاقی گراوٹ کے باوجود لوگوں کو تشدد پر نہیں اُبھارا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ اپنا ہاتھ مبارک یزید پلید کے ہاتھ میں نہیں دیا اور بیعت یزید سے انکار کر دیا۔ جو کہ حقیقتاً بقائے اسلام کی جنگ تھی، جس کی آبیاری آپؑ نے اپنے اور اپنے رُفقاء کے خون سے کی۔[2] اس تصور کے تحت ”حق“ کو حالات کے مطابق تبدیل ہونے والا یا مفاد کے تابع سمجھنے کی بجائے ایک مستقل اور غیر متغیر قدر ماننا چاہیئے۔

عصرِ حاضر میں اخلاقی نسبیت (Moral Relativism) کا رجحان بڑھ رہا ہے، جیسا کہ:

- سچائی کو مفاد کے مطابق بدلا جاتا ہے۔
- طاقت کو حق کا معیار سمجھا جاتا ہے۔
- غلط کو ”جائز“ مانا جاتا ہے۔

اخلاقی مطلقیت اس رجحان کو چیلنج کرتی ہے اور یہ مؤقف پیش کرتی ہے کہ:

- اخلاقی اصولوں کی بنیاد، مفاد نہیں بلکہ حقیقت ہے۔
- سچائی کو حالات کے تابع کرنا اخلاقی انحراف کے مترادف ہے۔
- جبکہ حق کو طاقت یا اکثریت سے نہیں ماپا جاسکتا۔

فِکر حسینؑ انہیں اُصولوں کی دلالت پیش کرتی ہے کہ ”حق“ کو کسی بھی سیاسی یا سماجی دباؤ کے تابع نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اخلاقی مطلقیت صرف نظریہ نہیں بلکہ عملی رویے کا نام ہے۔

2-اخلاقی مزاحمت
(Ethical Resistance Theory)

اخلاقی مزاحمت سے مراد وہ تصور ہے کہ جس کے تحت ظلم، ناانصافی اور طاقت کے غیر اخلاقی استعمال کے خلاف آواز بلند کرنے کو محض ایک اختیاری عمل نہیں بلکہ اخلاقی فریضہ مانا جاتا ہے۔ یہ نظریہ غلط چیز پر خاموشی سادھنے (passive acceptance) کی بجائے متحرک انکاری (active resistance) بننے پر زور دیتا ہے۔

آج کل معاشرے میں ایک اہم مسئلہ خاموش تماشائی (culture of silence) بنتا ہے۔ جہاں لوگ:

- ناانصافی دیکھ کر بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔
- طاقتور کے خوف سے سچ نہیں بولتے۔
- ظلم کو معمول سمجھ لیا جاتا ہے۔
- مظلوم کو خاموش رہنے پر زور دیا جاتا ہے۔

یہ رویہ سماجی سطح پر ناانصافی کو بڑھاوا دیتا ہے جو کہ معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ لوگوں کے عقائد و نظریات صرف اور صرف وقتی مفادات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جبکہ اخلاقی مزاحمت اس رویے کو رد کرتے ہوئے بنیادی اصول مہیا کرتی ہے کہ:

- مزاحمت صرف سیاسی عمل نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔
- ظلم کے خلاف خاموشی خود ایک اخلاقی ناکامی ہے۔
- انصاف کے قیام کیلئے عملی اقدامات ضروری ہیں۔

کربلا میں مزاحمت ایک فعال (active) اور اصولی عمل کے طور پر سامنے آئی، جہاں ناانصافی اور ظلم و بربریت کے سامنے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ کربلا کا جہاد قیام تھا جو غاصبیت، کفر، تاریکی، منافقت اور فسق کے خلاف، دو شہزادوں کی نہیں بلکہ دو نظریات اور دو سوچوں کی جنگ

---

[2] (ایضاً)

تھی- یہاں مسئلہ صرف حکومت کا نہیں تھا بلکہ اسلام کی زندگی کا تھا، جس کی آبیاری امام حسینؓ نے اپنے اور اپنے رُفقاء کے خون سے کی-[3] فِکرِ حسینؓ سے یہ تصور آج کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل کے تناظر میں اخلاقی مزاحمت کی بنیاد فراہم کرتا ہے-

3-اصولی قیادت
(Principled Leadership Model)

اصولی قیادت سے مراد ایک ایسی لیڈرشپ ہے جو ذاتی مفادات، اقتدار یا وقتی فائدے کی بجائے اخلاقی اصولوں کو ترجیح دے کر اجتماعی فلاح و انصاف کے لئے کام کرے- فقرِ شبیری سے نسبت کا دعویٰ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم گفتار کے غازی بننے کی بجائے رسمِ شبیری ادا کرنے کے لئے 'میں' اور 'انا' کا خول اُتار پھینکیں-[4] اس تصور میں قیادت کو ایک ”طاقتی منصب“ کی بجائے ”اخلاقی ذمہ دار“ کے طور پر دیکھا جاتا ہے-

عصرِ حاضر میں قیادت کا بحران ایک نمایاں مسئلہ ہے، جہاں:

- فیصلے اُصولوں کے بجائے مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں-
- قیادت ذاتی مفادات کے تابع کام کرتی ہے-
- اور عوامی فلاح کو نظر انداز کیا جاتا ہے-

ایسی قیادت جو اصولوں پر قائم رہے وہی اِن بحرانوں کا متبادل ماڈل پیش کرتی ہے- جیسا کہ:

- قیادت کو جوابدہ (accountable) ہونا چاہیے-
- قیادت کو ذاتی فائدے کے بجائے اجتماعی مفادات کو ترجیح دینی چاہیے-
- فیصلے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں-

حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی قیادت، سچائی، ایفائے عہد اور حب الوطنی جیسے استعاروں کا منبع نظر آتی ہے، جن میں:

- آفاقی و حقیقی اُصولوں کو اقتدار پر ترجیح دینا-
- اجتماعی مفاد کو ذاتی مفادات پر فوقیت دینا-
- قیادت کا ہر وقت قربانی کے لئے تیار رہنا-

مَردِ حُر اپنی روشن ضمیری اور کمال تصرف سے ہر آنے والے فتنے کو بھانپ لیتا ہے اور اپنی قوم کو دامِ فریب میں آنے سے بچا لیتا ہے- دورِ جدید کے فتنوں سے بچانے کے لئے فکرِ حسینؓ سے مزین مردِ حُر کی رہنمائی درکار ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ہر دور میں موجود رہی ہے- بھلا جو نفسانی خواہشات کے بندھنوں کا اسیر ہو اور خواہشاتِ نفس کے ہاتھوں کھلونے کی حیثیت رکھتا ہو، وہ بھلا دین اور عزت کا محافظ کیسے ہو سکتا ہے، اور نہ ہی اُمّت کی باگ ڈور اُس کے حوالے کی جا سکتی ہے-[5] یہ ماڈل دورِ جدید کے سیاسی اور سماجی نظام کے لئے ایک متبادل اور بہترین فریم ورک فراہم کرتا ہے- یہ تینوں تصورات ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ یکساں طور پر مربوط نظام کا ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں- جیسا کہ:

- اخلاقی مطلقیت: حق کی بنیاد فراہم کرتی ہے-
- اخلاقی مزاحمت: حق کے دفاع کا طریقہ فراہم کرتا ہے-
- اصولی قیادت: حق کو اجتماعی سطح پر نافذ کرنے کا نظام فراہم کرتی ہے-

یوں یہ فریم ورک فِکرِ حسینؓ کے تناظر میں ایک مکمل اخلاقی و سماجی نظام تشکیل دیتا ہے جو فرد، معاشرہ اور ریاست، تینوں سطحوں پر قابلِ اطلاق ہے- آج کم و بیش 1400 سو برس گزرنے کے باوجود سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا پیغام، فکر اور فلسفہ حق و صداقت دینِ اسلام کی سربلندی کا روشن باب ہے- جس نے بھی آپؓ کے افکار و نظریات سے استفادہ کیا وہ کامیاب و کامران ٹھہرا-

☆☆☆

---

[3] ذیشان دانش، محمد، (جولائی، 2024ء)، ”نواسہ رسولؐ شانہ رسولؐ پر“ مشمولہ، ”مرآۃ العارفین انٹرنیشنل“ چیف ایڈیٹر سلطان احمد علی، لاہور، العارفین پبلی کیشنز

[4] منظور حسین، مفتی محمد، (جولائی، 2024ء)، ”فقرِ شبیری“ مشمولہ، ”مرآۃ العارفین انٹرنیشنل“

[5] ضیاء الدین، میاں محمد، (جولائی، 2024ء)، ”سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ): نظریہ توحید کے پیامبر“ مشمولہ، ”مرآۃ العارفین انٹرنیشنل“

ہیر وازم کا جدید تصور اور اسوہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ

بابر جان خوازی خیل

ہیر وازم کا تصور ہمیشہ سے عالمی مفکرین کا موضوع رہا ہے اور ہر دور کے دانشور ایسے اقدار کا تعین کرتے رہے ہیں جن کو اپنا کر انسان اس تصور کا حقدار ٹھہر تا ہے- بحر حال تاریخ میں ہمیشہ سے یہ تصور ارتقاء پذیر رہا ہے جو وقت، حالات اور ثقافت کے ساتھ بدلتا رہا ہے- تاہم حسینی ماڈل کے سامنے آنے کے بعد اس تصور کیلئے وہ اخلاقی معیارات، اصول اور اقدار قائم ہو گئے ہیں جن کو نظر انداز کرنا اب اہل فکر کیلئے آسان نہیں ہے-

قدیم معاشروں میں حکومتی اور عوامی تعلق کی نوعیت اور امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی فکری جدت:

زیر نظر مضمون کے موضوع پر بحث کرنے سے پہلے قدیم معاشروں میں حکومت اور عوام کے تعلق کی نوعیت اور اس تعلق میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی طرف سے پیدا کی گئی فکری جدت کا ایک تقابلی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے- حکومت اور عوام کا تعلق ہمیشہ سے سیاسی فلسفے کا بنیادی موضوع رہا ہے- قدیم معاشروں میں حکومتی جواز زیادہ تر طاقت، روایت اور مذہبی تقدیس پر مبنی تھا- اس تعلق میں عوام کی حیثیت اطاعت گزار رعایا تک محدود تھی اور یہ تعلق زیادہ تر یک طرفہ تھا جہاں حکومت ایک مقتدر اور عوام تابع ہوتے تھے- اس تعلق کے تصور کی اخلاقی بنیادوں پر تشکیل ایک تدریجی عمل سے گزرا جہاں بلاشبہ فکر امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے اس تعلق کو ایک نئی جہت عطا کی-

قدیم مصر اور میسوپوٹیمیا میں حکمران کو خدائی نمائندہ تصور کیا جاتا تھا اور حکومتی اقدار کو مذہبی تقدیس حاصل تھی- اس کے باعث عوام کی اطاعت ایک مذہبی فریضہ سمجھی جاتی تھی- ان کے ہاں عوامی شرکت اور سیاسی شمولیت کا تصور ناپید تھا- قدیم یونان کی بات کی جائے تو وہاں اس تعلق کے تصور میں کچھ تبدیلی تو آئی مگر یہ صرف ایک مخصوص طبقے تک محدود تھی- مثلاً دانشوروں کی رائے یا صرف مردوں کی شمولیت وغیرہ- قدیم رومی سلطنت کو دیکھا جائے تو اس میں قانونی نظام اور شہریت کے تصور نے کچھ ترقی ضرور کی تاہم اقتدار بدستور اشرافیہ کے ہاتھ میں مرتکز رہا- اس طرح ان معاشروں میں بتدریج عوامی حکومتی تعلق میں کچھ وسعت ضرور آئی مگر مساوات، عوامی شمولیت اور ہم آہنگی کا فقدان رہا-

اس کے برعکس امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے حکومت کے جواز کو اخلاقی اصولوں، عوامی رضا مندی اور انصاف سے مشروط کیا-

عوامی- حکومتی تعلق کو ایک اصولی اور اخلاقی بنیاد فراہم کی- جس کے تحت عوام محض اطاعت گزار رعایا نہیں اور نہ ہی حکومتی ظلم کے خلاف کھڑا ہونا سیاسی بغاوت ہے بلکہ یہ ایک اصولی اور اخلاقی ذمہ داری ہے- اس طرح آپؓ نے مزاحمت کو ایک اخلاقی فریضے کے طور پر پیش کیا-

اس کے ساتھ ساتھ آپؓ عوامی شمولیت اور رضامندی کی فکر سامنے لائے اور یہ اصول واضح کر دیا کہ جبر سے حاصل کی گئی وفاداری عوامی رضامندی کی عکاس نہیں ہو سکتی- لہٰذا عوامی رضامندی کو حکومتی جواز کا بنیادی عنصر قرار دیا-

مزید آپؓ نے حکومت کے وراثت اور طاقت پر مبنی جواز کو چیلنج کیا اور اس کو عدل و انصاف اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہونے کا تصور پیش کیا-

اس تقابلی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ آپؓ کی فکر محض ایک وقتی رد عمل نہیں تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اصولی مؤقف تھا جو قدیم سیاسی تصورات سے واضح طور پر مختلف تھا

اور بعد کے سیاسی تصورات کے لیے مشعل راہ ہے- آپ کی فکری جد و جہد کے باعث یہ واضح ہوا کہ اقتدار کی اقدار کو اخلاقیات اور اصولوں کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ اخلاقیات اور اصولوں کو فقط اہلِ اقتدار کی منشاء پہ چھوڑا جائے-

عرب معاشرے میں ہیروازم کا تصور:

اب عرب معاشرے میں ہیروازم کے ارتقائی تصور کا جائزہ لیتے ہیں اور اسے اسوۂ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی روشنی میں پرکھتے ہیں- قبل از اسلام عرب معاشرے میں ہیروازم کو بہادری، قبائلی وفاداری اور جنگی مہارت سے جوڑا جاتا تھا- جبکہ اسلام نے اس تصور کو اخلاقی، روحانی اور اصولی بنیادوں پر استوار کیا- امام حسینؓ کی جد وجہد خصوصاً معرکہ کربلا اس نئے ہیروازم کے تصور کی اعلیٰ ترین مثال اور اظہار کے طور پر سامنے آیا جو تعلیماتِ اسلام سے واضح ہوا جس میں حق، عدل اور انسانی وقار کیلئے قربانی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے-

ہیرو ازم ہر معاشرے کا بنیادی تصور اور موضوع رہا ہے- عرب معاشرے میں ہیروازم کے تصور کے منفرد ارتقائی سفر یعنی کہ جاہلی دور کی قبائلی شجاعت سے لے کر اسلامی دور کی اخلاقی اور روحانی عظمت تک کی تبدیلی کا تجزیہ کیا جائے تو اسوہ امام حسینؓ اس سفر کا نکتۂ عروج ثابت ہوتے ہیں- جاہلی عرب معاشرے میں ہیرو وہ شخص ہوتا تھا جو جنگ میں بہادری دکھائے، اپنے قبیلے کی حفاظت کرے اور دشمن پر غالب آئے- عرب شعراء نے اس تصور کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا- یہ شعراء اپنے قبیلوں کے جنگجوں کی تعریف کرتے اور انہیں مثالی ہیرو کے طور پر پیش کرتے تھے- اس میں خاص نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ بہادری کو سراہا جاتا تھا لیکن اس میں اخلاقی اصولوں کی واضح بنیاد موجود نہیں تھی- البتہ انتقام فخر اور قبائلی برتری اس تصور کے بنیادی محرکات تھے-

اس کے برعکس اسلام نے ہیروازم کی نئی تعریف متعارف کرائی جہاں ہیروازم کے تصور کو جسمانی بہادری سے نکال کر، آفاقی حق کی خاطر اصول پہ قائم رہتے ہوئے، اخلاقی استقامت، صبر اور تقویٰ سے جوڑ دیا- اس تصور کا حامل وہ ہے جو حق پر قائم رہے نہ کہ وہ جو لازمی جنگ جیتے- اسوۂ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا قیام و عمل اس کی درست تشریح اور ترجمانی کرتا ہے- آپؓ نے قبائلی مفاد کی بجائے ایک آفاقی پیغام کی خاطر اصولی مؤقف اختیار کیا اور اس مؤقف کیلئے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حق کی خاطر آخری حد تک جاکر ہیروازم کے تصور کو نئی معنویت عطا کی- اس طرح آپؓ نے اپنی فکری اور روحانی قوت کے ذریعے خود کو قربانی کے استعارے کے طور پر ثابت کیا-

ان دونوں تصورات کی بنیاد، مقصد، ذرائع اور نتائج میں واضح فرق ہے- ہیرو وہ نہیں جو لازمی طور پر جیت جائے بلکہ وہ ہے جو حق پر قائم رہے اور اصولی استقامت کو ترجیح دے- اسی طرح مزاحمت کا مقصد ذاتی یا قبائلی مفاد نہیں بلکہ اجتماعی بھلائی اور ظلم کے خلاف ہونا چاہیے- پس علاقیت اور قبائلیت کی بجائے عالمگیریت، اصول اور اخلاقی اقدار کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور قربانی یا استقامت کا مظاہرہ اس ضمن میں عمل میں لانا چاہیے-

دورِ جدید کا تصورِ ہیروازم:

یہ تصور ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے جو قدیم زمانے کے جنگجوں اور دیومالائی طاقت کے حامل شخصیت سے شروع ہو کر قرونِ وسطیٰ کے مذہبی اور روحانی شخصیت سے گزرتے ہوئے دور جدید کے انفرادی آزادی و عقل و دانش کے معیار کو اپناتے ہوئے موجودہ دور میں ایک اصلاحی سماجی اور روزمرہ ہیروازم کے فکری تصور تک پہنچا ہے- اس جدید تصور ہیرو ازم کا خاکہ بنانے میں مختلف ادوار کے فلاسفہ کی فکر نمایاں ہے- تاہم ان میں اہم اور زیادہ اثر رکھنے والے رجحانات بیان کیے جاتے ہیں-

کارل یونگ کا ہیروازم (Archetype، ہیرو ایک نفسیاتی علامت ہے) ایک جدید نفسیاتی نظریہ ہے- جوزف کیمبل کی Monomyth Hero کی Narrative Theory یعنی کہ ہیرو ایک سفر سے گزرتا ہے، زیادہ تر جدید

ادب اور فلمیں اسی ماڈل پر بنتی ہیں- جان پال سارترے کا وجودی فلسفہ یعنی کہ ہیرو وہ ہے جو اپنی معنی خود پیدا کرے- کانٹ کے اخلاقی فلسفے اور فریڈرک نطشے کا ماڈل یعنی کہ انسان اپنی اقدار خود وضع کرتا ہے-

جدید ہیروازم کی خصوصیات:

دورِ جدید کے تصورات کے مطابق ہیرو کی شخصیت میں جن خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہے، وہ درج ذیل ہیں:

- اخلاقی جرات
- ایثار
- سماجی انصاف
- اجتماعی مفاد

جدید فلسفہ اور نفسیات کے مطابق:

"ہیروازم وہ عمل ہے جس میں فرد خطرہ مول لیتا ہے، دوسروں کیلئے قربانی دیتا ہے، اخلاقی اصول کی خاطر اقدام کرتا ہے"-[1]

"ہیروازم کی اہم خصوصیات میں جرأت، ایثار، اخلاق استقامت اور عملی اقدام شامل ہے"-[2]

"جدید فلسفہ میں ہیروازم ایک سماجی عمل ہے اس کا مقصد انسانی فلاح اور اقدار کا تحفظ ہے"-[3]

عالمی مفکرین کے ہاں تصورِ ہیروازم

عالمی مفکرین کے ہاں ہیروازم کا کوئی مشترک تصور موجود نہیں ہے بلکہ ہر فکری روایت میں اس کی بنیاد، مقصد اور معیار مختلف ہے-سب سے پہلے:

اساطیری بنیاد:

قدیم یونانی تہذیب میں ہیرو وہ شخصیت ہوتی تھی جو دیوتاؤں سے قریب تعلق رکھنے کے باعث غیر معمولی طاقت رکھتا ہو اور جو عظیم جنگی کارنامے سرانجام دیتا ہو- مثال کے طور پر ہرکولیس وغیرہ یہ ہیرو اکثر ٹریجڈی کا شکار ہوتے تھے یعنی عروج وزوال کا تصور-

کنفیوشس:

کنفیوشس کے تصور میں ہیرو وہ عظیم اور شریف انسان (Junzi) ہے جو معاشرتی اور خاندانی رشتوں میں کامل توازن اور ہم آہنگی پیدا کرے- اس کا ہیرو کوئی گوریلا نہیں بلکہ ایک اعلیٰ اخلاق کا پیکر ہے جو 'رسم ورواج اور فرض شناسی' (Ritual and Duty) کی پابندی کرتے ہوئے معاشرے کو امن کا گہوارہ بناتا ہے- یہاں ہیروازم ذاتی نمود و نمائش کے بجائے اجتماعی فلاح اور مسلسل خود احتسابی کا نام ہے-

گوتم بدھ:

گوتم بدھ کے ہاں ہیرو وہ روشن ضمیر انسان ہے جو انسانی دکھوں (Dukkha) کی حقیقت کو پالے اور اپنی اندھی خواہشات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے- اس کا ہیروازم کسی بیرونی دشمن سے لڑنے کے بجائے، جہالت اور نفسانیت کے خلاف "روحانی بیداری" (Spiritual Awakening) کا ایک طویل اور کٹھن سفر ہے-

سقراط:

سقراط کے نزدیک ہیرو وہ ہے جو حق اور سچائی کی تلاش میں اپنی جان کی بازی لگا دے- اس کا ہیروازم طاقتِ طبعیہ، حرکتِ جسمانیہ اور قوتِ غذائیہ کے بجائے 'اخلاقی اور فکری جرات' (Moral and Intellectual Courage) پر کھڑا ہے- سقراط کے ہاں ہیرو وہ ہے جو معاشرے کے فرسودہ عقائد پر سوال اٹھائے اور زہر کا پیالہ پی کر بھی حق اور اپنے اصولوں پر رتی برابر سمجھوتہ نہ کرے-

ارسطو:

ارسطو کے نزدیک ہیرو ایک عظیم شخصیت رکھتا ہے لیکن ایک داخلی کمزوری کا شکار ہوتا ہے اور اسی کمزوری کی وجہ سے زوال پذیر ہو جاتا ہے- ارسطو کے ہیرو کے عروج وزوال کا بنیادی نکتہ ادبی کیتھارسس یعنی جذباتی اثر قائم کر کے

[1]Franco, Z., Blau, K., & Zimbardo, P. (2011). Heroism: A Conceptual Analysis.
[2]MacLennan, N. (2021). Heroism – What Is It?
[3]Shevchenko, O. (2024). Philosophical concept of heroism

کمزوریوں پر قابو پانے کی ترغیب دینا ہے- یہ ہیرو ازم کے تصور کے ادبی و اخلاقی رجحان کے قریب ہے-

مارکس اور یلئس:

رومن ایمپائر کے فلسفی بادشاہ مارکس اور یلئس کے نزدیک ہیرو ازم کا مطلب اپنے نفس اور خواہشات کو تسخیر کرنا ہے- ایک سٹوئک (Stoic) ہیرو وہ ہے جو کائنات کے بدلتے حالات اور مصائب کے سامنے چٹان کی طرح کھڑا رہے اور اپنا فرض نہایت سکون اور تمکنت کے ساتھ ادا کرے- اس کے ہاں ہیرو وہ ہے جو داخلی فتح (Inner Conquest) حاصل کرے اور جذبات کی رو میں بہنے سے قطعی انکار کر دے- جیسا کہ اس کا مشہور ترین قول ہے:

"You have power over your mind, not outside events. Realize this, and you will find strength".

"آپ کے پاس اپنے ذہن پر اختیار ہے، بیرونی حالات پر نہیں- اس بات کو سمجھیں، اور آپ کو حقیقی طاقت مل جائے گی"-

میکیاولی:

میکیاولی کی نظر میں ہیرو وہ حکمران ہے جو نہ صرف طاقت حاصل کرے بلکہ اسے برقرار بھی رکھے چاہے اس کیلئے اسے اخلاقیات کے اصولوں سے ہٹنا بھی پڑے- وہ اخلاقیات کا دوہرا نظام (Dual Standard of Morality) وضع کرتا ہے جس میں حکمران اور عوام کے لیے اخلاقیات کا معیار مختلف ہوتا ہے- میکیاولی سیاسی اور طاقت پر مبنی ہیرو ازم کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے-

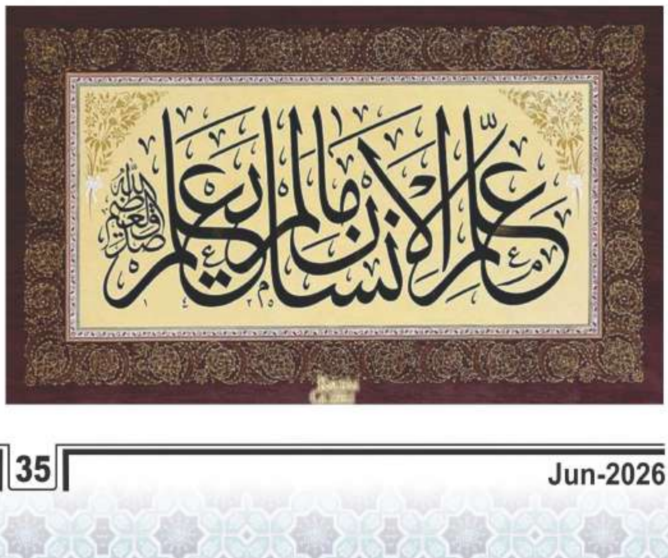

فریڈرک نطشے:

ان کے مطابق ہیرو وہ ہے جو روایتی اخلاقیات رد کرے اور اپنی نئی اقدار خود تخلیق کرے- ہیروازم کا یہ نظریہ وجودی اور فلسفیانہ رجحان کی وکالت کرتا ہے-

سارترے:

ان کے نزدیک ہیرو وہ انسان ہے جو ذمہ دار آزادی رکھتا ہو، کسی پہلے سے طے شدہ معانی کے بغیر جیتا ہو اور اپنے انتخاب سے اپنی حقیقت بناتا ہو- یہ بھی وجودی رجحانات ہے-

کال یونگ:

ہیرو کوئی حقیقی فرد نہیں بلکہ انسانی لاشعور کا ایک (Archetype) ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے یہ نفسیاتی ہیروازم کی مثال ہے-

جوزف کیمبل:

Monomyth ہیرو ایک عالمی کہانی ہے جو ایک سفر سے گزرتا ہے، خود کو چیلنج کرتا ہے، آزمائشوں (Adventure) سے گزرتا ہے اور تبدیل (transform) ہو کر واپس آتا ہے- اس کی بنیاد اساطیری فلسفہ پر ہے اور جدید فلموں اور ادب کی بنیاد زیادہ تر اس ماڈل پر ہے-

ان تمام نظریات کا مطالعہ کرنے سے یہ فکر سامنے آتی ہے کہ مغربی فلسفہ میں ہیرو اپنے معنی خود پیدا کرتا ہے اور اسلامی ماڈل، جس کی نمائندگی امام حسین (رضی اللہ عنہ) کرتے ہیں، میں ہیرو حق کے معانی کو زندہ کرتا ہے- مغربی مفکرین کے افکار اور شعوری تحریک اپنی اہمیت کے باوجود اخلاقی ابہام کا شکار رہتے ہیں- اسی باعث یہ ممکنہ طور پر ایک بہتر اخلاقی نظام قائم نہیں کر پاتے ہیں- ان کی تحریکوں میں کامیابی کسی اصول پہ قائم رہنے کی بجائے نتیجے سے جڑی ہوتی ہے- اس کے برعکس اسوۂ امام حسین (رضی اللہ عنہ) میں مزاحمت، جرأت، عظمت، معنی اور شعوری و نفسیاتی سفر کا ہر پہلو عالمگیری آفاقی اصولوں کے تابع ہوتا ہے اور ایک واضح اصولی اخلاقی انقلابی ماڈل پیش کرتا ہے- یہاں کامیابی کا معیار نتیجے کی بجائے ان آفاقی اخلاقی اصولوں پہ قائم رہنا ہے- جہاں مزاحمت کسی نفرت یا تعصب

کی بجائے کسی اصول مثلاً ناانصافی کے خلاف کی جاتی ہے اور اس کا واحد مقصد نظام کی تبدیلی یا حکمران کی برطرفی ہی نہیں بلکہ اقدار کی اصلاح بھی ہے-

دور جدید میں ہیرو ازم، انقلابی اور مزاحمتی تناظر میں:

دور جدید کے ہیرو ازم کے تصور کے مزاحمتی اور انقلابی پہلو کو فکری اور عملی پیمانے پر پرکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اکثر سیاسی، سماجی اور ثقافتی بغاوت سے جوڑا جاتا ہے اور دور جدید میں یہ تصور ایک مزاحمتی اور انقلابی استعارے کے طور پر سامنے آتا ہے- مثلاً اکثر انقلابی سیاسی شخصیات جیسے چی گویرا، نیلسن منڈیلا وغیرہ جو جبر کے خلاف مزاحمت کرتے تھے، اسی طرح حقوق انسانی، صنفی مساوات اور ماحولیاتی تحفظ کی سماجی تحریکیں جو اسٹیٹس کو (Status quo) کو چیلنج کرتی ہیں-اس کے علاوہ میڈیائی علامتی و رومانوی اور جذباتی ہیرو ازم کے تصورات بھی پروان چڑھ رہے ہیں- تاہم سوال یہ ہے کہ آیا ہر مزاحمت یا انقلاب حقیقی معنوں میں اخلاقی بھی ہوتا ہے؟ کیا ان تحریکوں میں عالمگیریت، اصولی ثبات اور اخلاقی سمت مبہم رہتی ہے یا یہ واضح رہتی ہے؟

اسوۂ امام حسین (رضی اللہ عنہ) اصولی اور اخلاقی فکری انقلاب کی ایک ایسی مزاحمتی اور انقلابی مثال پیش کرتی ہے جس کا مقصد محض اقتدار کی تبدیلی ہی نہیں بلکہ ساتھ اقتدار کے اقدار کی تطہیر ہے-ان تصورات کو اسوۂ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے عملی ہیرو ازم کے تصور کے تناظر میں دیکھا جائے، جس کی بنیاد اصولی مزاحمت، اخلاقی انقلاب، قربانی اور آفاقی مزاحمتی پیغام پر مبنی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مخصوص علاقائی یا قومی سیاسی مفاد کی بجائے ایک فاسد نظام کے خلاف تھی جو حق و باطل کے امتیاز پر مبنی تھی- یہ عالمگیریت کے اصول کی نشاندہی کرتی ہے-

مقصد حصول اقتدار کی بجائے اخلاقی اقدار کی بحالی کی جدوجہد تھی- اس کو Inward Revolution یعنی انسان کے اندر حق کی بیداری کے جذبے کی بحالی کہتے ہیں- یہ اخلاقی سمت کی طرف اشارہ کرتی ہے- اس کے برعکس دور جدید کے یہ مزاحمتی و انقلابی ہیرو بیشتر اوقات اپنی توجہ صرف طاقت کے توازن کو بدلنے پر مرکوز رکھتے ہیں-

آپ اپنے نظریہ اور اصولی مؤقف پر نفع و نقصان اور نتائج کو خاطر میں لائے بغیر اصولی استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کیلئے قربانی کی آخری حد تک پہنچے- یہ اصولی ثبات کی گواہی ہے-

اسلامی ہیرو ازم: کثیر الجہتی صفات کا اجتماع اور جامعیت

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہیرو ازم کا تصور کسی اسطوراتی (Mythological)، محض مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) یا کسی مخصوص جنونیت تک محدود اور یک رخا (One-dimensional) نہیں ہے، بلکہ یہ کثیر صفات کے اجتماع کا ایک نہایت متوازن، جامع اور عملی ماڈل ہے- اسلام کا ہیرو محض طاقت کا مظہر یا میدانِ جنگ کا فاتح نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ہیرو شپ کا آغاز اعلیٰ ترین اخلاقی اور انسانی اقدار سے ہوتا ہے- اس کی سب سے روشن اور بے مثال دلیل یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوہِ صفا پر جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو کوئی مافوق الفطرت دعویٰ کرنے کے بجائے اپنا جو اخلاقی استعارہ (Resume) پیش کیا، اس کی بنیاد صداقت اور امانت کی آفاقی صفات پر استوار تھی- یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں ہیرو ازم کسی ایک مخصوص سانچے کا اسیر نہیں بلکہ مختلف اور متنوع شکلوں میں اپنے کمال پر نظر آتا ہے-

اسلامی ہیرو ازم کا اولین اور آفاقی خاکہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کی سیرت میں اپنی مکمل ترین شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے- قرآنِ مجید کے بیان کردہ ہیروز محض کسی ایک مخصوص صفت کے حامل نہیں، بلکہ وہ انسانیت کی مجموعی تہذیبی ارتقاء اور روحانی بقا کے استعارے ہیں- جہاں سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل (علیہما السلام) کی عظیم قربانی نفس کو شعوری طور پر حق کے سامنے قربان کر دینے کا اعلیٰ ترین ہیرو ازم پیش کرتی ہے، وہیں سیدنا ایوب اور سیدنا یعقوب (علیہما السلام) کا بے مثل صبر، داخلی استقامت اور روحانی مزاحمت کا وہ کمال ہے جس کی نظیر

مادی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسلام کا ہیرو طاقت کے عروج پر بھی انتقام کا اسیر نہیں ہوتا، جس کا حتمی ثبوت سیدنا یوسف (علیہ السلام) کا عفو و درگزر ہے۔ یہ تصورِ ہیرو ازم محض مابعد الطبیعاتی نہیں بلکہ مادی اور سائنسی شعور کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جیسا کہ سیدنا نوح (علیہ السلام) کا جہاز (کشتی) ایجاد کرنا اور سیدنا داؤد (علیہ السلام) کا دفاعی مقاصد کیلیے زرہ بنانا، ہیرو ازم کے تکنیکی اور فلاحی پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح سیدنا سلیمان (علیہ السلام) کا پرندوں کی بولیاں سمجھنا کائناتی ہم آہنگی کی علامت ہے، جبکہ حضرت ذوالقرنین کا طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک کا سفر محض علاقائی تسخیر نہیں، بلکہ عدلِ الٰہی اور حاکمیتِ حق قائم کرنے کی بے مثال جدوجہد ہے۔ مزید برآں، سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کا اپنی قوم کو فرعون کے جبر سے نجات دلانا سیاسی مزاحمت کی معراج ہے، اور سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کا زہد مادی دنیا کی رغبتوں سے مکمل بے نیازی کا وہ مقام ہے جو ایک ہیرو کو دنیاوی ہوس سے پاک کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے اس آفاقی ماڈل کے شانہ بشانہ، اسلامی ہیرو ازم کا تصور خواتین کی روحانی، فکری اور مزاحمتی اساس کے بغیر نامکمل ہے۔ اسلام نے عورت کو محض تاریخ کا خاموش کردار نہیں بلکہ حق کی بقا کا ایک فعال استعارہ بنایا ہے۔ فرعون کے جابرانہ اور استحصالی محل میں سیدہ آسیہ کی حمایتِ حق، دراصل ایک باطل نظام کے عین قلب میں نظریاتی بغاوت کا عظیم ترین ہیرو ازم ہے۔ سیدہ ہاجرہ کی سعی (تلاشِ آب و بقا) ایک ماں کی وہ بے مثال جدوجہد اور توکل ہے جسے خالق نے رہتی دنیا تک کے لیے شعائرُ اللہ بنا کر حتمی عظمت بخش دی، جبکہ سیدہ مریم کی پاکدامنی معاشرتی تہمتوں کے خلاف تقدس کی وہ ڈھال ہے جو قیامت تک ایک روشن مثال بن گئی۔ اسلامی تاریخ کا یہ روحانی سفر اس وقت اپنی معراج کو چھوتا ہے جب سیدہ آمنہ (علیہا السلام) مکہ کے خشک پہاڑوں میں بیٹھ کر شام کے محلات کو نور سے روشن ہوتا دیکھتی ہیں، جو دراصل ایک عظیم انقلاب کی فکری بصیرت (Vision) تھی۔ اسی تسلسل میں ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کی لازوال وفا اور بے دریغ قربانیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ تحریکِ حق کا ابتدائی اور سب سے بھاری بوجھ ایک خاتون کی استقامت نے اٹھایا۔ علمی اور فکری میدان میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کا تفقہ (گہرا فقہی شعور) دانشورانہ ہیروشپ کا نقطہ کمال ہے۔ اور جب بات طہارت، حیا، پردہ داری اور ترکِ دنیا کی ہو، تو مخدومۂ کائنات، سیدۃ النساء العالمین بی بی فاطمۃ الزہراء (علیہا السلام) کا زہد، پردہ اور تمکنتِ شاہی وہ آفاقی معیار مقرر کرتے ہیں جو قیامت تک کے لیے روحانی اور اخلاقی ہیرو ازم کا غیر فانی ماڈل ہے۔

اس ہمہ گیر ہیرو ازم کی عملی جھلک صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور اکابرینِ اسلام کی زندگیوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ جہاں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی بے لوث اور وفادارانہ دوستی ہیرو ازم کا ایک پرامن استعارہ ہے، وہیں حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کی حق و باطل میں قطعی فرق کرنے کی بصیرت، حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کی بے مثل حیا اور حضرت علی المرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کا بحرِ علم، اسلامی ہیرو کے مختلف مگر متوازی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہیرو ازم کا یہ تصور اس قدر وسعت پذیر ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف حضرت امیر حمزہ (رضی اللہ عنہ) کی بے پناہ حکمت و شجاعت شامل ہے، وہیں دوسری جانب حضرت اویس قرنی (رضی اللہ عنہ) کی اپنی والدہ کی خاموش اور بے لوث خدمت بھی ہیرو ازم کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہے۔ یہ ایک ایسا نظامِ اقدار ہے جس میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح (رضی اللہ عنہ) کی امانت داری کو بھی وہی توقیر حاصل ہے جو حضرت بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) کے بدترین تشدد کو صبر سے برداشت کر کے قولِ حق پر ثابت قدم رہنے کو حاصل ہے۔

مزید برآں، یہ اصولی ماڈل اپنے اندر اس قدر توازن رکھتا ہے کہ اس میں ایک طرف حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) کی درویشی، فقر اور دنیا سے بے رغبتی مستحقِ تحسین قرار پاتی ہے، تو عین اسی وقت حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) اپنی ناقابلِ

شکست جنگی حکمتِ عملی اور عسکری طاقت کے ساتھ "اللہ کی تلوار" کے روپ میں ایک عظیم ہیرو تسلیم کیے جاتے ہیں- اسی طرح، حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) کا راز داری (Secret-keeping) میں کمال اور حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) کی اجتہادی و فکری صلاحیت، ہیرو ازم کے عملی، نفسیاتی اور دانشورانہ پہلوؤں کی تکمیل کرتے ہیں- مہاجرین کا راہِ خدا میں اپنا سب کچھ ترک کر دینا اور انصارِ مدینہ کا بے مثال اخوت اور ایثار پر مبنی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنا، اسلامی ہیرو ازم کی وہ اجتماعی اور سماجی جہتیں ہیں جو کسی اور تہذیب کے تصورِ ہیرو ازم میں یاں یکجا نہیں ملتیں- ان تمام صفات کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام کا ہیرو کسی ایک زاویے تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اصول، اخلاق اور حق کی سربلندی کا داعی ہے- ہیرو ازم کی یہی وہ تمام متفرق مگر کامل صفات ہیں جو اپنے نقطہ عروج پر میدانِ کربلا میں اسوۂ حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی صورت میں یکجا ہو کر ایک ابدی اور آفاقی مزاحمتی ماڈل کی صورت اختیار کر گئیں-

تصورِ مردِ مومن: علامہ اقبال کے ہیرو ازم کا فکری جوہر

علامہ اقبال کا تصورِ "مردِ مومن" درحقیقت انہی انبیائے کرام، مقدس خواتینِ اسلام اور اکابرِ صحابہ کی کثیر الجہتی صفات کا ایک جامع اور شعوری تسلسل ہے- اقبال کا ہیرو (مردِ مومن) نطشیائی فلسفے کے سپر مین کی طرح محض طاقت کا اندھا پجاری یا اخلاقیات سے عاری حکمران (میکیاولی کا ہیرو) نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا مجسمۂ حق ہے، جو جلال اور جمال کا ایک کامل امتزاج ہے- اقبال کا مردِ مومن ان آفاقی کرداروں کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے جن کی بنیاد میں کامل یقین، صبر اور باطل نظاموں کے خلاف بے خوف مزاحمت شامل ہو- وہ ایک طرف فقر، درویشی، حیا اور بے لوث قربانی جیسی قلبی اقدار کا امین ہوتا ہے، تو دوسری جانب تسخیرِ کائنات اور حاکمیتِ حق کے لیے ایک ناقابلِ شکست فکری اور عسکری قوت کا درجہ بھی رکھتا ہے- بالفاظِ دیگر، اقبال کا تصورِ ہیرو ازم تاریخِ اسلام کی ان تمام متفرق اعلیٰ صفات یعنی طہارت، شجاعت، عشق اور عدل کا وہ نقطۂ کمال ہے، جہاں ایک انسان محض طاقت کا مظہر نہیں رہتا، بلکہ کائنات کیلئے سراپا رحمت اور فاسد نظاموں کیلئے ایک ابدی شمشیر برہنہ بن جاتا ہے-

جب اقبال کا یہ تصورِ مردِ مومن تاریخ میں اپنی حتمی اور مجسم شکل تلاش کرتا ہے، تو اس کی نظریاتی اور عملی معراج اسوۂ امام حسین پر آ کر مکمل ہوتی ہے- گویا اسلامی ہیرو ازم کے تمام تر آفاقی تصورات کی انگوٹھی میں حسینی مزاحمت ہی وہ ابدی نگینہ ہے، جس کے بغیر حق کی بقا اور عشقِ الٰہی کا کوئی خاکہ مکمل نہیں ہوتا-

مغربی / جدید اور اسلامی / حسینی فلسفہ ہیرو ازم کا تقابلی جائزہ:

ممکن ہے کہ یہ دونوں روایات اخلاقی جرأت، انصاف اور انسانی وقار کے تصور سے خالی نہ ہوں لیکن ان کی بنیاد اور عملی ترجیحات واضح طور پر مختلف رہی ہیں- اس کیلئے اسلامی اور مغربی دونوں فلسفوں میں اخلاقیات کے بنیادی ماخذ یعنی (Foundation of Ethics) کے تصور کو سمجھنا ضروری ہے- اسلامی فلسفے میں اخلاقیات کا بنیادی ماخذ وحی اور اس کا سرچشمہ خدا کا علم ہے جبکہ مغربی فلسفے میں اس کی بنیاد عقل اور اس کا سرچشمہ انسانی فکر و تجربہ ہے- دوسرا مغرب اخلاقیات کے تصور کو فائدے اور نقصان کے تناظر میں دیکھتا ہے- جیسا کہ جیریمی بینتھم، جان سٹوَرٹ مل وغیرہ- اسلام اخلاقیات کو نفع اور نقصان کے ترازو میں تولنے کی بجائے اسے اصول کی نگاہ سے دیکھتا ہے- مغرب اداروں اور قانون کے ذریعے حقوق کو نافذ کرتا ہے جبکہ اسلام انہیں ان بیرونی اقدامات کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی عزم اور قربانی کے جذبے کی نگاہ سے دیکھتا ہے- مغرب کا زور ظاہری ذرائع پر ہے جبکہ اسلامی نقطہ نظر میں

ظاہری ذرائع کے ساتھ ساتھ اندرونی روحانی انقلاب کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

جدید تصور کے وجود میں آنے کی بنیاد (Ontology) میں مرکز نظر انسان ہے۔یعنی اس تصور کے خاکے کا خالق وہ خود، اس کیلئے اصول وضوابط طے کرنے والا وہ خود اور اس کے لیے حق و باطل کے معیار قائم کرنے والا خود ہے۔اب چونکہ اس کی وجودی بنیاد کا مرکز ہی انسان ہے تو ہیرو ازم کے تصور کا خاکہ بنانے کیلئے اس کے علم کا ذریعہ (Epistemology) بھی انسانی عقل و تجربات سے حاصل ہوتا ہے، جس میں اتنی گنجائش ہے کہ ہٹلر، سٹالن، مودی اور نیتن یاھو جیسے سارے سفّاک قاتل اپنی اپنی قوموں کے ہیرو بن جاتے ہیں۔پس انسانی عقل و دانش ہی ہیرو ازم کیلئے اخلاقی معیاراور اس کا بنیادی خاکہ وضع کرتی ہے۔جیسا کہ دور جدید کے مختلف فلسفوں مثلاً وجودیت (Existentialism)، مفادیت پسندی (Utilitarian) وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔اسی سبب ان کے وضع کردہ اخلاقی معیار کو نسبتی غیر یقینی تصور اخلاق (Relative Moral Standard) کہا جائے گا۔چونکہ اس تصور کا مرکز انسان، اس کی بنیاد عقلِ ثابت کی بجائے سفاکوں کی سہولت کار عقل اور اس کیلئے درکار اخلاقی معیارات اٹل نہیں تو ان بنیادوں کے زیرِ اثر اس کے مقاصد انسان مائل اور محض انسانی سماجی اصلاح و فلاح قرار پاتا ہے جو کہ ظاہری دنیا تک محدود ہے۔لہٰذہ نتیجتاً ان کی طرف سے پیش کردہ قربانی اور کامیابی کے معیارات بھی دنیاوی اثرات اور نتائج کے تناظر میں واضح کیے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) سے کوئی ہیرو ازم کا فلسفہ اخذ کیا جائے تو اس کی دلیل میں مرکز خدا اور اس کی خوشنودی ہے۔اسی لیے ہیرو ازم کے تصور کا خاکہ بنانے کیلئے بنیادی ذریعہ علم و عقلِ کامل، احکاماتِ الٰہی و اقدار ہے۔اسی وجہ سے اس فلسفے کے اخلاقیات کا معیار بھی مختلف ہے یعنی ان اخلاقی اقدار کی پاسداری کیلئے جدوجہد و قربانی ہوگی جو قرآن و سنت کے ذریعے واضح کردی گئی ہیں۔یہ اخلاقی اقدار (Objective Moral Truth) یعنی کہ اصل اور معروضی اخلاقی سچائی ہے۔پس اس فکر کے زیر اثر مقصد بھی انسانی سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ دین و حق کا تحفظ و بقاء ٹھہرتا ہے۔تاہم ہیرو ازم کی تمام تر خصوصیات اور خوبیوں کو اس ضمن میں عمل میں لایا جائے گا نہ کہ کسی عارضی دنیاوی مقصد کے لیے۔حسینی کامیابی کا معیار بھی نتائج پہ منحصر نہیں بلکہ اصول پہ قائم رہنے سے جڑا ہے۔جو دنیاوی اثر کے ساتھ ساتھ ابدی حقانیت کا متلاشی ہے۔

ہیرو ازم کے جدید تصور میں جو بھی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں ان کی مثال آپؑ کے عمل میں نظر آتی ہے اور آپؑ انہیں خصوصیات کے مظہر نظر آتے ہیں لیکن اصل فرق دونوں تصورات کے مرکز و محور، بنیاد و مقصد اور اخلاقی، قربانی و کامیابی کے معیار میں ظاہر ہوتا ہے۔مرکزیت کے حوالے سے دورِ جدید کے ماڈل مفاد مائل (Interest Centered) ہیں۔مثلاً آفاقی تعبیر شدہ حق کی خاطر یا احکامِ الٰہی کے تحت قرار شدہ باطل کے خلاف پوزیشن لینے میں اور اس کیلئے خطرہ مول لینے میں اور مفادات سے تعبیر شدہ معاشرے کی بھلائی کے تصور کے لیے خطرہ مول لینے میں فرق ہے۔اسی طرح وضع کردہ اخلاقیاتِ الٰہی جو کہ اٹل اور آفاقی ہے (Absolute Moral Truth) کیلئے جرات اور قربانی کا مظاہرہ کرنا اور بات ہے اور مفادات کی سیاست کے تحت پروان چڑھائے جانے والی اخلاقی توضیحات کے ذریعے وضع کردہ اخلاقیات کے اصولوں کیلئے عملی اقدامات کرنا اور بات ہے۔پس جدید ماڈل کو شناخت مغربی تصور ''نیشن سٹیٹ'' کے تحت وجود میں آنے والی سیاسی / حکومتی مشینری دیتی ہے جبکہ حسینی ماڈل کو شناخت خدا اور تاریخ سے ملتی ہے۔

☆☆☆

خوف، دباؤ اور استقامت

واقعہ کربلا کا نفسیاتی مطالعہ

وسیم فارابی
شعبہ فلسفہ، جی سی یونیورسٹی لاہور

ابتدائیہ:

خوف اور دباؤ ایسے نفسیاتی احوال ہیں جنہیں ہر انسان قدرتی طور پر محسوس کرتا ہے اور ان سے نمٹنے کی بھرپور کوشش بھی کرتا ہے۔ جدید علمِ نفسیات کے مطابق، انسان کئی وجوہات کی بنا پر خوف اور دباؤ کے تجربات سے گزرتا ہے، ان سب تجربات میں بنیادی عنصر بچاؤ کا ہوتا ہے۔ جب انسان کو کسی شے سے اپنی جان، مال یا کسی بھی عزیز چیز کے چلے جانے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو انسان میں خوف اور خوف کے نتیجے میں دباؤ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں انسان کے پاس دو راستے ہوتے ہیں کہ یا تو اس خوفناک صورتحال کا مقابلہ کرے یا پھر راہ فرار اختیار کرے۔ انسان کونسا راستہ اختیار کرتا ہے یہ انسان کی خودی کی اندرونی ساخت پر منحصر ہے۔ اس ساخت کی تشکیل میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں لیکن عمومی طور پر اس تشکیل کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی خودی کی تشکیل میں ظواہر کا کردار زیاد ہوتا ہے۔ ان کی عقل ظواہر سے رہنمائی لیتی ہے اور اسی بنیاد پر انسان کے عمل کی رہنمائی کرتی ہے۔ دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی خودی کی تشکیل میں نظریات کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان کی عقل ظواہر کے ساتھ ساتھ نظریات سے بھی رہنمائی لیتی ہے اور وہ اسی بنیاد پر انسان کے عمل کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس مضمون کا مقصد جدید علمِ نفسیات کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے واقعہ کربلا کا نفسیاتی جائزہ لینا ہے۔

نظریاتی فریم ورک:

اس حصے میں وہ بنیادی نفسیاتی نظریات بیان کیے جائیں گے جن کی روشنی میں واقعہ کربلا کو ایک نفسیاتی کیس اسٹڈی کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید علمِ نفسیات میں کسی بھی انسانی رویے کو سمجھنے کیلئے عموماً ایک ہی زاویہ کافی نہیں ہوتا بلکہ مختلف نظریاتی ماڈلز کو یکجا کر کے تجزیہ کیا جاتا ہے۔

1- ادراکی جائزے کا نظریہ:

(Cognitive Appraisal Theory)

یہ نظریہ Richard Lazarus نے 1984ء میں پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق، کسی محرّک یا واقعہ (eliciting event) کی انسان جو تعبیر کرتا ہے وہی اس کے جذبات کی نوعیت کو متعین کرتی ہے۔ لہٰذا، ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات لوگوں میں مختلف جذبات پیدا کر سکتی ہیں۔[1] فرض کریں کہ آپ اکیلے جنگل سے گزر رہے ہیں۔ آپ کو اچانک سامنے ایک ریچھ نظر آتا ہے۔ اب اس لمحے اصل فیصلہ کن چیز وہ ریچھ نہیں بلکہ آپ کی ذہنی تعبیر ہے۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ یہ ریچھ خطرناک ہے اور آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو آپ پر فوراً خوف و دباؤ کے جذبات طاری ہو جائیں گے، دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی اور آپ جان بچانے کی خاطر بھاگنے یا چھپنے کی کوشش کریں گے۔

اگر آپ اس واقعہ کی یہ تعبیر کرتے ہیں کہ ریچھ نے آپ کو دیکھا ہی نہیں اور وہ خاموشی سے اپنے راستے پر چلتا جائے گا تو آپ بہت کم خوف و دباؤ کا شکار ہوں گے۔ اسی

[1]https://psu.pb.unizin.org/psych425/chapter/cognitive-appraisal-theory/

طرح اگر آپ ایک ماہرِ حیوانات ہیں تو آپ میں اس ریچھ سے متعلق جاننے کا تجسس پیدا ہوگا- آپ خوف و دباؤ کی بجائے تجسس اور جوش و خروش جیسے جذبات کو محسوس کریں گے-

2- معنی اور وجودی نفسیات کا نظریہ:

(Logotherapy)

یہ نظریہ Viktor Frankl نے 1946ء میں پیش کیا- اس نظریے کے مطابق، انسان کی ایک بنیادی نفسیاتی ضرورت ”معنی“ کی تلاش ہے- شدید خوف اور دباؤ میں بھی انسان اسی وقت استقامت دکھا سکتا ہے جب وہ اپنی تکلیف کو کسی بڑے مقصد یا معنی کے ساتھ جوڑ دے- تکلیف بذاتِ خود انسان کو توڑتی نہیں بلکہ تکلیف کا ”معنی“ انسان کی نفسیاتی کیفیت کو متعین کرتا ہے- یوں معنی کی موجودگی دباؤ کو نہ صرف قابلِ برداشت بلکہ بعض اوقات بامعنی بنا دیتی ہے-[2]

3- اخلاقی شناخت اور اخلاقی ترقی کا نظریہ

Moral Identity and Development Theory

یہ نظریہ Kohlberg نے 1958ء میں پیش کیا- اس نظریے کے مطابق، انسان میں اخلاقی ارتقاء کے مطابق اخلاقی استدلال (moral reasoning) تین سطحوں سے گزرتا ہوا ترقی کرتا ہے- انسان اپنے بچپن سے ایک پختہ عمر تک، سادہ اصولوں کی پیروی سے شروع ہو کر اخلاقی بنیادوں پر مبنی سوچ اور مزید پیچیدہ آفاقی اصول تک پہنچتا ہے- ابتدائی مراحل میں انسان کی توجہ محض قوانین کی پابندی پر ہوتی ہے- درمیانی مراحل میں انسان تعلقات، سماجی توقعات اور ہم آہنگی کو اہمیت دیتا ہے جبکہ آخری مراحل میں انسانی سوچ زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے اور آفاقی اصولوں اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں-[3] جس شخص میں یہ شناخت پختہ ہوتی ہے وہ بیرونی عناصر یا معاشرتی دباؤ کی بجائے آفاقی اصولوں اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے-

4- اطاعت اور سماجی دباؤ

(Obedience & Social Pressure)

یہ نظریہ Stanley Milgram نے 1960ء کی دہائی میں اپنے مشہور تجربات کے ذریعے واضح کیا- ان کے تجربے میں شرکاء کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ ایک نفسیاتی تجربے کا حصہ ہیں جس میں انہیں ایک دوسرے شخص کی غلطیوں پر اسے بجلی کے جھٹکے دینے ہوں گے- جیسے جیسے شرکاء کو ہدایت دی جاتی، وہ مزید شدت کے ساتھ بجلی کے جھٹکے دیتے تھے- حالانکہ سامنے موجود شخص کی چیخیں اور تکلیف ان کو محسوس ہو رہی تھیں لیکن حیران کن طور پر بہت سے لوگ صرف اس لیے یہ عمل کرتے رہے کیونکہ ایک بااختیار قوت (Authority Figure) انہیں ایسا کرنے کا حکم دے رہی تھی- اس تجربے نے یہ ظاہر کیا کہ عام لوگ بھی محض بااختیار طاقت کی اطاعت میں ایسے کام کر سکتے ہیں جو ان کے ذاتی اخلاقی اصولوں کے خلاف ہوں- ملگرام کے مطابق، جب انسان خود کو حالتِ اطاعت (agentic state) میں پاتا ہے یعنی وہ خود کو صرف حکم پر عمل کرنے والا سمجھتا ہے تو وہ اپنے عمل کی اخلاقی ذمہ داری کو کم محسوس کرتا ہے اور یہی کیفیت اطاعتِ اختیار کو ممکن بناتی ہے-[4]

کربلا اور اس کے ظاہری خطرات:

1- سیاسی و سماجی صورتحال

سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے دور میں اسلامی معاشرہ ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا جہاں اسلامی سیاسی نظام بہت زیادہ طاقتور تو ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس دور کی حکومت کی قانونی و دینی حیثیت پر اعتراضات بھی کھڑے ہو چکے تھے- اسی بنیاد پر حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے یزید لعین کی بیعت کرنے سے انکار کیا کیونکہ یزید لعین کا انتخاب غیر قانونی طریقے سے کیا گیا تھا- یہ صورتحال اور اس دور کا سماجی ماحول بھی نفسیاتی دباؤ کو متاثر کرنے والا اہم عنصر تھا-

[2] https://positivepsychology.com/viktor-frankl-logotherapy/
[3] https://www.verywellmind.com/kohlbergs-theory-of-moral-development-2795071
[4] https://psychology.fas.harvard.edu/people/stanley-milgram

اطاعت اور سیاسی وابستگی جیسے عوامل افراد کے فیصلوں پر گہرا اثر ڈال رہے تھے- اس طرح فرد اکثر اپنے ذاتی اخلاقی فیصلے کی بجائے اجتماعی دباؤ کے تحت عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جسے جدید نفسیات میں Social Conformity اور Cognitive Dissonance کہا جاتا ہے-[5]

2-طاقت کا عدم توازن

واقعہ کربلا میں ایک واضح نفسیاتی و سماجی عنصر "طاقت کا عدم توازن" تھا- ایک طرف یزیدی طاقت اور عددی برتری موجود تھی جبکہ دوسری طرف ایک محدود مگر نظریاتی طور پر مضبوط گروہ تھا- جدید سماجی نفسیات میں یہ صورتحال اکثر اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ کمزور گروہ پر دباؤ زیادہ ہوتا ہے جبکہ طاقتور گروہ اطاعت اور کنٹرول کے ذریعے اثر انداز ہوتا ہے- یہی عدم توازن انسانی فیصلوں، خوف اور استقامت کے درمیان کشمکش کو شدید بنا دیتا ہے-

3-وجودی خطرہ

نفسیاتی لحاظ سے کربلا کی صورتحال کو "وجودی خطرہ" کہا جا سکتا ہے، یعنی ایسی حالت جس میں جان کا خطرہ، خاندان کی حفاظت کا خطرہ اور امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے گروہ کی بنیادی بقا کا سوال تھا- جب یہ سب ایک ساتھ موجود ہوں تو اس قسم کی صورتحال میں انسانی ذہن عام طور پر دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے جس کا فوری اثر "Fight or Flight Response"[6] کی صورت میں سامنے آتا ہے- یا تو یہ بقا کو ترجیح دیتا ہے یا پھر کسی بڑے مقصد یا اصول کی خاطر بقا کو ثانوی حیثیت دے کر مقصد کی بقا کیلئے صورتحال کا دلیری سے مقابلہ کرتا ہے- یہی وہ بنیادی نفسیاتی کشمکش ہے جو اس واقعے کو انسانی رویے کے مطالعے کے لیے اہم بناتی ہے-

واقعہ کربلا کا نفسیاتی جائزہ:

امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور ان کے گروہ نے درج بالا خطرات کے باوجود یزید لعین کی بیعت کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے قول اور فعل سے اس کی کھلے عام مخالفت کی- حتیٰ کے آخری دم تک لڑتے ہوئے سب نے اپنی جان قربان کر دی مگر یزید لعین کی بیعت کو اختیار نہیں کیا- اس گروہ کے اقوال، احوال اور افعال کو سامنے رکھتے ہوئے اس گروہ کی نفسیاتی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1- مستحکم خودی

ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آپؓ کی خودی مستحکم تھی- خودی کے مستحکم ہونے کی وجوہات کو Kohlberg اور Viktor Frankl کے نظریات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے- یہ ایسا گروہ تھا جس میں اخلاقی شناخت اور اصولوں کی پاسداری کا شعور بہت زیادہ پختہ تھا- دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ آپؓ کے نزدیک زندگی کی اصل اس کے بامعنی ہونے سے مشروط ہے اور زندگی کو معنی ہمیشہ وہ نظریات دیتے ہیں جو آفاقی ہوں اور گروہِ انسانی کی رہنمائی کیلئے انہیں لازم قرار دیا جاتا ہو- اس لیے آپؓ Cognitive Dissonance اور Social Conformity کا شکار ہونے کی بجائے اپنے نظریات پر استقامت سے قائم رہے-

2-جرأت و بہادری

سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور آپؓ کے ساتھی درج بالا خطرات کا ادراک رکھتے تھے لیکن وہ ان خطرات کی وجہ سے کسی قسم کے خوف کا شکار نہیں تھے- اس بات کو Richard Lazarus کے نظریے سے سمجھا جا سکتا ہے- یہ گروہ دیکھ رہا

[5]https://www.apa.org/pubs/books/Cognitive-Dissonance-Intro-Sample.pdf
[6]https://www.health.harvard.edu/healthy-aging-and-longevity/understanding-the-stress-response

تھا کہ یزیدی لشکر ان سے زیادہ طاقتور ہے، انہیں اپنی جان کے خطرے کا ادراک بھی تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ عوام یزیدی لشکر کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں لیکن انہوں نے اس ادراک کی تعبیر ویسی نہیں کی جو ایک عام انسان ایسی صورتحال میں کرتا۔ انہوں نے یہ تعبیر کی کہ یزید غاصب ہے اور یہ لشکر ایک ایسے شخص کی نمائندگی کرتا ہے جس کی مخالفت کرنا ہی واحد راستہ ہے۔ اس لیے امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور آپؓ کے لشکر میں خوف کا جذبہ پیدا ہونے کی بجائے جرأت اور بہادری کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپؓ نے موت کو شہادت، تکالیف کو راحت اور مفاہمت کو ناحق سے تعبیر کیا اور ہر خوف سے آزاد ہوگئے۔ اس کیفیت کو Viktor Frankl اپنی ذات یا خودی سے بلند ہونے یعنی Self-Transcendence کا نام دیتا ہے جس میں انسان اپنے مقصد کی خاطر اپنی ذات اور اس کے مادی لوازمات کو فراموش کرکے صرف اپنے مقصد کو سامنے رکھتا ہے۔

3- حق کی مفاہمت

امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے سیاسی مصلحت پسندی اختیار کرنے کی بجائے حق کے ساتھ مفاہمت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ اسی بنیاد پر بعض لوگ اہلِ بیت کی سیاسی بصیرت پہ اعتراض کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام عالی مقام حق نما ہیں ان کا نظریہ اور حالات کو دیکھنے کا انداز عام افراد سے مختلف ہے کیونکہ آپؓ حق کی روشنی میں دیکھتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ اہلِ بیت کی بنیادی خصوصیت بھی رہی ہے اور اسے ایک تاریخی روایت کی مثال سے مزید واضح کرتا چلوں کہ جب حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو گورنری سے معزول کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) نے آپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ ابھی انہیں معزول مت کریں۔ حالات بہتر ہونے تک آپ انہیں گورنر رہنے دیں۔ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے ان کے مشورے کو پسند کیا لیکن وہی کیا جو آپ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ مغیرہ مجھے معلوم ہے سیاسی مصلحت یہی ہے مگر میں وہی کروں گا جو حق ہے۔

اس بات کا نفسیاتی پہلو Kohlberg اور Milgram کے نظریات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ امام حسین (رضی اللہ عنہ) اخلاقی اور اصولی طور پر اتنے مضبوط تھے کہ کسی بھی صورتِ حال میں اپنے اصولوں کے خلاف نہیں جاتے تھے۔ وہ عوامی مفاہمت یا سیاسی مصلحت کے نام پہ آفاقی نظریات پہ سمجھوتہ کرنے کی بجائے حق کی مفاہمت اختیار کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی صحیح اور غلط کا ادراک رکھنے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ Milgram کے تجربے نے اسی امر کو واضح کیا ہے کہ عوام جب حالتِ اطاعت اور کسی بیرونی طاقت کے زیرِ اثر ہوں تو وہ صحیح اور غلط کا فرق بھول جاتے ہیں۔ لیکن حضرت علی، امام حسین اور اہل بیت اطہار (رضی اللہ عنہم) نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل ترین حالات میں حق کی مفاہمت اختیار کرتے ہیں۔

4- یزیدی لشکر کی نفسیات

یزیدی لشکر کی نفسیات امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی نفسیات کے عین مخالف تھیں۔ یزیدی لشکر حالتِ اطاعت میں تھا تو حق کی مفاہمت کی بجائے طاقتور کی مفاہمت اختیار کیے ہوئے تھا۔ ان میں اخلاقی شناخت اور خودی کا استحکام دونوں ہی کمزور تھے۔ انہوں نے صحیح اور غلط کی

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

تمیز کو پس پشت ڈال دیا کیونکہ وہ ایک با اختیار قوت کے وجود سے مرعوب ہو چکے تھے- ان کے رہنما اعلیٰ انسانی اصول نہیں بلکہ یزیدی حکومت کا خوف اور حکومتی مراعات کا لالچ تھا جس کا ثبوت عمر بن سعد اور شمر ملعون جیسے افراد کا اس لشکر کا سردار ہونا ہے- انہوں نے یزیدی حکومت کے خوف کو ویسے ہی تعبیر کیا جیسا کہ انہیں بظاہر نظر آیا کہ اگر یزیدی قوت کی مخالفت کی تو انہیں سخت سزا کا سامنا کرنا پڑے گا اور حکومتی مراعات سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا- اس تعبیر نے ان پر خوف کو طاری کر دیا اس لیے انہوں نے حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) اور آپؓ کے لشکر کو اپنا مخالف سمجھ کر ان کی سخت مخالفت کی اور بالآخر انہیں شہید کر کے اپنے خوف پر قابو پایا-

نتیجہ:

واقعۂ کربلا کے نفسیاتی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ دباؤ اور خوف جیسے جذبات کا پیدا ہونا مخصوص قسم کے تجربات کیلئے لازم نہیں ہے بلکہ انسان ان تجربات کی کیسی تعبیر کرتا ہے وہ تعبیر یہ تعین کرتی ہے کہ کس قسم کے جذبات انسان میں پیدا ہوں گے- انسان کسی تجربے کی کیسی تعبیر کرتا ہے اس کیلئے انسان کی رہنمائی اس کی خودی کی تشکیل، اخلاقی شناخت اور آفاقی اصول کرتے ہیں جو انسان کے شعور پر غالب ہو کر اس کی ذات کی تعمیر کرتے ہیں- سیدنا امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنی مستحکم خودی، اعلیٰ اخلاقی شناخت اور آفاقی اصولوں پر کاربندی کی وجہ سے بظاہر دباؤ اور خوف کے تجربے کی ایسی تعبیر کی جس سے انہوں نے جرأت و بہادری سے استقامت کو اختیار کئے رکھی- مگر یزیدی لشکر نے غیر مستحکم خودی، اخلاقی شناخت کی غیر موجودگی اور آفاقی اصولوں کی بجائے مادی فوائد کو ترجیح دینے کی وجہ سے اسی تجربے کی ایسی تعبیر کی جس نے ان پر دباؤ اور خوف کو طاری کر دیا- یعنی ایک گروہ قوت و تعداد میں کم ہونے کے باوجود بے خوف تھا اور دوسرا گروہ طاقتور ہونے کے باوجود خوفزدہ تھا- اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان خوف اور دباؤ کا شکار ہو کر صحیح اور غلط کی تمیز بھول جاتے ہیں اور حق کی مفاہمت کی بجائے طاقتور کی مفاہمت کر جاتے ہیں- امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے حق کو اختیار کیا اور ہر خوف اور دباؤ سے ماوریٰ ہو گئے-

اختتام کرنے سے قبل بیان کردہ ساری نفسیاتی کیفیات اور حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی استقامت کو ذہن میں رکھ کر علامہ محمد اقبال صاحب کے یہ اشعار دیکھئے:

☆ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

☆ ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

☆ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

☆ خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خُدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

☆☆☆

کربلا
ضبطِ نفس، قوت ارادہ اور آزادی کا بحرِ ہِمَم

محمد ذیشان دانش

تاریخِ انسانی میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ناقابل فراموش ہیں لیکن ان واقعات کی تعداد انگشت شمار ہی ہے جو زمانی حدود میں مقید نہیں رہ سکتے بلکہ فکر، شعور اور اخلاقی اقدار کے دائمی استعارے بن جاتے ہیں- واقعۂ کربلا ان واقعات کی معراج ہے- واقعہ کربلا فقط دس دن کی داستان نہیں، یہ اپنا ماضی بھی رکھتا ہے اور مستقبل بھی-واقعہ کربلا کا یک جہتی مطالعہ کرنا جیسے مذہبی یا تاریخی سانحہ کے طور پر اس واقعہ کی معنوی وسعت کو محدود کرنے کے مترادف ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ واقعہ کربلا کو مجموعی طور پر سمجھنا شاید ممکن نہ ہو-اس لئے اس کی مختلف جہات کا مطالعہ از حد ضروری ہے - انہی جہات میں ایک جہت ضبطِ نفس، قوت ارادہ اور آزادئ ارادہ بھی ہے- کربلا درحقیقت انسانی ارادے، آزادیِ فکر اور اخلاقی جرأت کا ایسا نقطۂ عروج ہے جہاں انسان اپنی ذات، اپنے ایمان اور اپنے اختیار کے ساتھ ایک فیصلہ کن مکالمہ کرتا ہے- اس مکالمے کے نتائج رہنمائی کے وہ کہکشاں ہیں جس کی تابندگی 1400 برس گزر جانے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی ، بلکہ جوں جوں علمِ انسانی ارتقائی منازل کو طے کرتے ہوئے شعور کے دریچوں کو وا کر رہا ہے، ہر دریچے میں کربلا سے رہنمائی کے مواقعوں کو ضیاء مل رہی ہے-

کیا کربلا محض قربانی کی داستان ہے؟ یا یہ قوتِ ارادہ (Willpower) ضبطِ نفس (Self-Control) اور آزادی ارادہ (Free Will) کی اعلیٰ ترین عملی تعبیر بھی ہے؟

قوت ارادہ (Will Power)

قوت ارادہ ’’برے یا مشکل حالات میں اپنے افعال، کو جاری رکھنا، ہار نہ ماننا اور کوشش کرتے رہنے کا نام ہے یہ ایک طاقت ہے جس میں انسان اپنے اہداف کو سامنے رکھتے ہوئے کوشش کو جاری رکھتا ہے اور حالات و واقعات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا جس کے باعث اس کی سعی میں کمی نہیں آتی-یعنی انسان اپنے افعال، اعمال، خواہشات اور جذبات اور خود حالات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دے اور اپنی کوشش کو ترک نہ کرے اور اپنے اہداف سے پیچھے نہ ہٹے اس کو قوت ارادہ کہتے ہیں‘‘- قوت ارادہ کو سمجھنے کے لئے حالات اور جز وقتی اہداف (Short Terms Goals) کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے-

مثلاً ایک انسان نظریاتی طور پر تو بہت پختہ ہے اور اپنی منزل و اہداف کے بارے میں خوب اچھی طرح جانتا ہے لیکن بعض اوقات کسی دباؤ یا حالات کے سامنے بے بس ہو کر وقتی طور پر کچھ ایسا کر جاتا ہے جو اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا - رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ مبارک سے آج کی جدید تاریخ تک ایسی ان گنت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ہم ان سب کی تفصیل میں جائے بغیر حضرت حر تمیمیؒ کی مثال پر اکتفا کرتے ہیں - حُر کو ابن زیاد نے سب سے پہلے حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے قافلے کی نگرانی پر مقرر کیا تھا جو ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ چند نفوس کے خلاف میدان میں اترا-ابن زیاد سے احکامات لیتے وقت بھی وہ جانتا تھا کہ خانوادہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل حق ہیں اور حق نما بھی لیکن اس وقت حالات کا جبر اس پر حاوی ہو گیا اور وہ قوت ارادہ کی کمزوری کے باعث اس قبیح فعل کو سرانجام دینے کیلئے رضامند ہو گیا، صبح عاشور وہ خود، اپنے بھائی اور غلام کے ساتھ لشکر یزید لعین کو چھوڑ کر قافلہ حسینؓ میں شامل ہوا اور شہادت کو گلے لگایا- قوت ارادہ

بنیادی طور پر ایک جز وقتی نفسیاتی عمل ہے جس کا دار و مدار ایک محدود وقت کیلئے ہو تا ہے- جدید نفسیات کے مطابق انسانی ذہن اس میں تھکاوٹ بھی محسوس کرتا ہے اور اپنے ہدف سے پیچھے بھی ہٹ جاتا ہے - ظاہر ہے جب حالات موافق نہ ہوں، اہداف کا حصول مشکل ہو، توانائی زیادہ خرچ ہو رہی ہو اور مشکلات ختم نہ ہو رہی ہوں تو کسی بھی انسان کا تھک جانا ایک نارمل اور عین فطرت کے قریب ہے-

اگر ہم فکر اسلامی کی بات کریں تو یہاں ارادہ فقط ایک نفسیاتی کیفیت نہیں بلکہ ایک روحانی عمل ہے جسے نیت بھی کہا جاتا ہے اور اسی نیت ہی پر اعمال کی بنیاد ہے- یہ جتنی سچی اور طاقتور ہو خدا کے حضور عمل کی جزا ویسے ہی ملتی ہے - ارادہ جتنا سچا اور روح کے قریب تر اور خلافِ نفس ہو گا اسی قدر اس میں توازن ہو گا- جدید نفسیات کے مطابق بھی انسان اپنے ارادے کو ایک خاص ڈھب میں لانے کی پریکٹس کرے تو اس کے اعمال میں توازن اور مضبوطی زیادہ آسکتی ہے-

المختصر !اگر انسان کی اقدار اور عادات میں ہم آہنگی ہو تو اس کے باعث بہترین انتخاب انسان کی فطرت بن جاتا ہے اور یہ قوت ارادہ اپنی تعریف کے مطابق ایک وقتی یا عارضی فیصلے میں کیفیت کی بجائے انسان کے کردار کی ایک بنیادی خوبی بن جاتا ہے-

ضبط نفس (Self-Control)

ضبط نفس سے مراد طویل المدتی اہداف کے حصول کیلئے اپنے جذبات، افعال، خواہشات اور رد عمل کو اپنے تابع کرنا ہے- ضبطِ نفس کی اصطلاح صوفیائے کرام (رحمۃ اللہ علیہم) کے ہاں خواہش نفسانی کے خلاف چلتے ہوئے، نفس امارہ، لوامہ اور ملہمہ کو نفس مطمئنہ، راضیہ و مرضیہ تک پہنچانا ہے- ان کے ہاں معرفتِ الٰہی کے حصول کیلئے اپنے نفس پر ضبط رکھتے ہوئے ہدف پر نگاہ رکھنا ضروری ہے- جبکہ کربلا میں ضبط نفس سے مراد حالات کے بدترین ہو جانے کے باوجود اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر ڈالنے کے بجائے اپنے افعال کی لگام کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا ضبط نفس ہے-

سانحہ کربلا میں کوئی اندرونی نفسانی کشمکش نہ تھی، بلکہ امامِ عالی مقام (رضی اللہ عنہ) تو پہلے ہی مقامِ رضیّہ و مرضیّہ پر فائز تھے- آپؓ تو جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں- اس لیے واقعہ کربلا خواہشِ نفس کی جنگ نہیں بلکہ حق، صبر، رضا اور الوہی مقصد کی تکمیل کا عظیم مظہر ہے- لہٰذا کربلا میں تو مصائب اور کشمکش بیرونی ہیں، امام عالی مقامؓ کے خلاف حالات کا جبر مسلسل ہے، ظلم کا بازار گرم ہے، ہٹ دھرمی کی مثال اسفل السافلین کے مقام پر ہے، بے شرمی کا لاوہ پک رہا ہے، بد تہذیبی کا سیل رواں ہے- ان بدترین حالات میں بھی آپؓ نے اپنا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا حالات کو نہیں سونپا- یزید لعین اور اس کے حواری یہی چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح ہمیں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی بیعت مل جائے تاکہ ہم اپنی بے جواز حکومت کو جواز دے سکیں لیکن آپؓ کے اس ضبطِ نفس کو خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے کس خوب صورت انداز میں پیش فرمایا:

> شاہ است حسین، بادشاہ است حسین
> دین است حسین، دین پناہ است حسین
> سر داد، نداد دست در دستِ یزید
> حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

”شاہ بھی حسینؓ ہیں، بادشاہ بھی حسینؓ ہیں- دین بھی حسینؓ ہیں، دین کی پناہ بھی حسینؓ ہیں- سر دے دیا مگر اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں نہیں دیا- حقیقت تو یہ ہے کہ لا الہ کی بنیاد بھی حسینؓ ہیں“-

آزادیِ ارادہ (Free Will)

آزادیِ ارادہ سے مراد انسان کی وہ صلاحیت اور نظریات ہیں جس کے ذریعے وہ مختلف ممکنہ اعمال میں سے اپنی عقل، شعور، خواہش، اقدار اور فیصلے کی بنیاد پر کسی ایک عمل کا انتخاب کرتا ہے- یعنی انسان صرف بیرونی حالات کے تحت عمل نہیں کرتا بلکہ اپنے ارادے اور اختیار سے فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا ہے- کربلا میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے جبر پر اختیار کو فوقیت دی - امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا فیصلہ آپؓ کی آزادی، خود مختاری اور حق کے ”شعوری انتخاب“ کا فیصلہ ہے- یزید لعین کی جبری بیعت کے خلاف آپؓ کا انکار دراصل

ایک اعلان تھا کہ رہتی دنیا تک کو یہ بتایا جائے کہ انسان محض حالات کا اسیر نہیں۔ آپؓ کی اس حریت فکر نے حالات کا رخ موڑا اور حق و باطل کو علیحدہ علیحدہ کر دکھایا۔

حاصل کلام:

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اگر انسان کی اقدار اور عادات میں ہم آہنگی ہو تو اس کے باعث بہترین انتخاب انسان کی فطرت بن جاتا ہے اور یہ قوت ارادہ اپنی تعریف کے مطابق ایک وقتی یا عارضی فیصلے میں کیفیت کی بجائے انسان کے کردار کی ایک بنیادی خوبی بن جاتا ہے۔ اب اگر اسی عمل کی رہنمائی آقا پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھرانہ مبارک اور خصوصا حسنین کریمین (رضی اللہ عنہما) کی مبارک زندگیوں سے لیں تو ہم جان جائیں گے کہ آپؓ کی اقدار اعلیٰ تھیں۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ آپؓ سے زیادہ اعلیٰ اقدار کسی کی ہو نہیں سکتیں، آپؓ دوشِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوار تھے، آپؓ نے بابِ مدینۃ العلم کی آغوش میں پرورش پائی جو فقط عالم ہی نہ تھے بلکہ رجل کرار تھے، جو جہاد کے دھنی تھے جو شجاعت کی مثال تھے، جو اتنے بہادر اور جری تھے کہ بہادری کو ان پر ناز تھا، آپؓ ابو تراب تھے، حکمت آپؓ کی گھٹی میں تھی، آپؓ اخی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے، آپؓ کی والدہ جنت کی خواتین کی سردار عالمہ، فاضلہ، مطیع فرمانبردار، صابرہ اور شاکرہ تھیں۔ حسنین کریمین (رضی اللہ عنہما) کے اعلیٰ اوصاف اور حقانیت و عظمت کے لئے آیت تطہیر اور آیتِ مباہلہ کی گواہی کافی ہے۔

حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ حالات کے جبر کو سب ہی قبول کر چکے تھے اور یہ جبر اب اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس کا آغاز تو مولائے کائنات حضرت علی (رضی اللہ عنہ) پر گھیرا تنگ کرنے سے ہوا اور آپؓ کو دار الحکومت مدینہ سے کوفہ تبدیل کرنا پڑا، تین جنگیں مسلط کی گئیں، آپؓ شہید ہوئے، منصبِ خلافت امام حسن (رضی اللہ عنہ) کو سونپا گیا، لیکن آپؓ نے بشارتِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکمیل میں صلح فرمائی اور خلافت سے دستبردار ہوئے تا کہ نانا جان کی اُمّت کا ناحق خون نہ بہے۔ منبروں سے سب و شتم کا سلسلہ چلا، حق داروں کو حق سے محروم کیا گیا، منبر کو تخت میں بدلا گیا، یزید لعین کے لئے جبر و ظلم سے بیعت لی جانے لگی اور پھر رات کی تاریکی میں جبر و استبداد کے سائے میں امام عالی مقام (رضی اللہ عنہ) سے بیعت کا تقاضا کیا گیا۔

یہ سالہا سال سے ہونے والا ظلم اپنے عروج پر تھا۔ آپ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کا مطلب ماضی میں ہوئے تمام غیر اسلامی و باغیانہ کاموں پر مہر حق ثبت کرنا تھا۔ آپؓ جانتے تھے کہ بیعت کر کے خوشحال زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ لیکن آپؓ نے اپنا اخلاقی فرض نبھایا اور جبر و ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے پورے کنبے اور ساتھیوں کے ساتھ خود کو راہ اسلام میں قربان کر دیا۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہ قوت ارادہ، ضبط نفس، کربلا کا تسلسل ہے جس کی شبیہ احسن ہمیں دین بچانے کی خاطر حضرت سیدہ بی بی زینب پاک (رضی اللہ عنہا) کی ہمت، کاوش اور قوی آواز و کردار کی صورت میں نظر آتی ہے۔

کتابِ عشق دو باب است کربلا و دمشق
یکے حُسین رقم کرد و دیگرے زینب

کربلا محض قربانی کا استعارہ نہیں بلکہ یہ انسانی ارادے کی وہ معراج ہے جہاں آزادیِ انتخاب، اخلاقی ذمہ داری اور روحانی بصیرت ایک نقطے پر آکر جمع ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

کلام

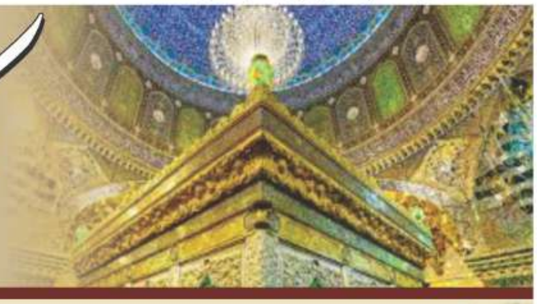

شاعر: نظیری نیشاپوری
مترجم: رانا محمد عظیم

زان پس حسین حجت حق در میان نهاد
منکر ز جهل تیر حسد در کمان نهاد

اس (یعنی حضرت امام حسنؓ) کے بعد حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حقانیت کی ایک روشن دلیل اور حجت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھا، لیکن منکروں نے اپنی جہالت کے باعث حسد وعداوت کے تیر کمان میں رکھ لیے۔

حق ز اولیا مقام ذبیح الهیش داد
در قبضه مشیت خویشش عنان نهاد

اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کرام میں امام حسینؓ کو (حضرت اسماعیلؑ کی مانند) "ذبیح الٰہی" کا مقام عطا فرمایا اور ان کے امور کی باگ ڈور اپنی مشیتِ کاملہ کے سپرد رکھی۔

حلقی که بوسه گاه نبی بود ظلم عهد
شمشیر زهر داده امت بر آن نهاد

وہ گلا جسے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محبت و شفقت سے بوسہ دیا کرتے تھے، اُسی گلے پر اس دورِ سلطنت کے ظلم اور امت کی بے وفائی نے زہر آلود تلوار رکھ دی۔

ذبح عظیم اشاره به قتل حسین بود
منت که بر خلیل خدای جهان نهاد

قرآن مجید میں مذکور "ذبحِ عظیم" درحقیقت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی عظیم قربانی کی طرف اشارہ تھا، یہ اللہ تعالیٰ کا وہ خاص احسان تھا جو اپنے خلیل حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر فرمایا۔

تعبیر کرد ازان به بلای مبین خلیل
کاندوه کربلای حسینش به جان نهاد

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی آزمائش کو قرآن مجید نے بلائے مبین سے تعبیر فرمایا، کیونکہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے کربلا کے غم کو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل و جان میں ودیعت کر دیا تھا۔

گرچه به صدق وعده براهیم را ستود
لیکن حسین شرط وفا در میان نهاد

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو وعدے کی سچائی اور فرمانبرداری پر سراہا، لیکن امام حسین (رضی اللہ عنہ) نے وفاداری کی شرط کو عملاً سامنے رکھ دیا۔

دادش مقام صبر و رضا تا شهید شد
با نفس مطمئنه قدم درجنان نهاد

اللہ تعالیٰ نے امام حسین (رضی اللہ عنہ) کو صبر و رضا کا ایسا بلند مقام عطا فرمایا کہ وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے اور "نفسِ مطمئنہ" کے ساتھ جنت میں تشریف آوری فرمائی۔

می راند در بلا و محن نفس جاهدش
تا روح پای بر زبر آسمان نهاد

ان کا مجاہد نفس مصائب اور آزمائشوں کے میدان میں ثابت قدم رہا، یہاں تک کہ ان کی روح بلندیوں کی طرف پرواز کر کے آسمانوں سے بھی اوپر جا پہنچی۔

شد حاصلش عذوبت روح از عذاب تن
جانش عزیز گشت چو تن در هوان نهاد

جسمانی تکالیف کے نتیجے میں ان کی روح کو پاکیزگی اور لطافت حاصل ہوئی اور جب انہوں نے اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیا تو ان کی جان اور بھی زیادہ عزیز و مکرم ہوگئی۔

حق مشهد حسین محل شهود ساخت
فردوس در مکاره و رنج جهان نهاد

اللہ تعالیٰ نے امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے مزار کو اپنی تجلیات اور روحانی مشاہدات کا مرکز بنا دیا، دنیا کی مشقتوں اور رنج و الم کے درمیان گویا فردوس کا نمونہ رکھ دیا۔

ابن زیاد سک به صلاح یزید شوم
شمشیر جور و کین به صف خاندان نهاد

بدبخت منحوس یزید کے مشورے اور ارادے سے ابنِ زیادِ خبیث اور ذلیل نے ظلم و کینہ کی تلوار اہلِ بیتؑ کے مقدس خاندان کے مقابل کھڑی کر دی۔

شط فرات راند ز طوفان کربلا
و آنگه سر حسین به خون روان نهاد

دریائے فرات کربلا کے ہولناک طوفانِ غم کا منظر بن گیا اور پھر امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا مقدس سر خون کے دھاروں میں تر کر دیا گیا۔

☆☆☆

نذرانۂ عقیدت درشانِ سید الشہداء رضی اللہ عنہ

شاعر: مستحسن رضا جامی

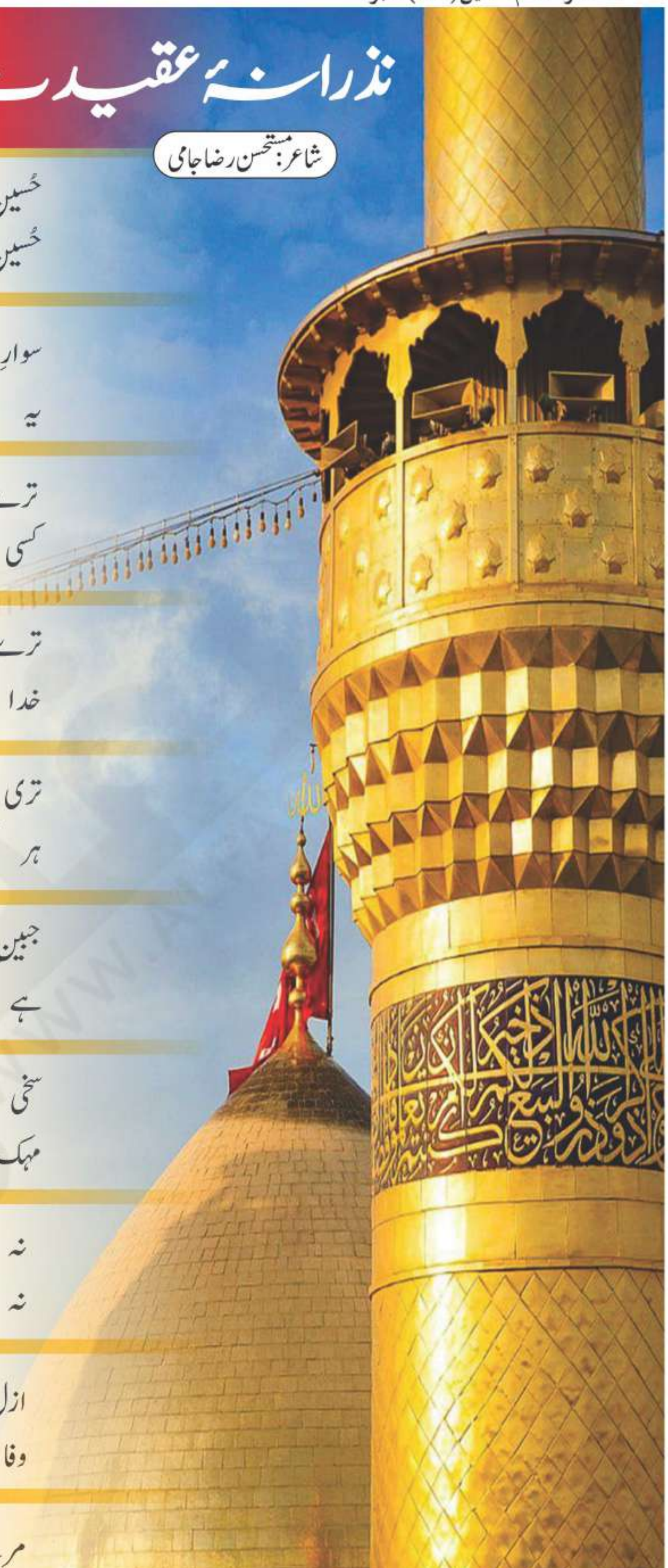

حُسینؓ حُسنِ جہاں، لا الہ الا اللہ
حُسینؓ مونسِ جاں، لا الہ الا اللہ

سوارِ دوشِ پیمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حُسینؓ ابنِ علیؓ
یہ خوشنما ہے سماں، لا الہ الا اللہ

ترے کمال ترے مرتبہ و منصب کا
کسی سے کیا ہو بیاں، لا الہ الا اللہ

ترے وجود میں صبر و رضا سمٹ آئے
خدا نے دی یہ کماں، لا الہ الا اللہ

تری شجاعت و قربانیوں کا قصۂ نم
ہر اک زباں پہ رواں، لا الہ الا اللہ

جبینِ وقت پہ دُنیائے بحر و بر پر بھی
ہے تیرا سجدہ عیاں، لا الہ الا اللہ

سخی حُسینؓ ترے گلشنِ منور سے
مہک رہا ہے جہاں ، لا الہ الا اللہ

نہ کوئی صبر کی ایسی مثال عرش پہ ہے
نہ ہے زمیں پہ یہاں، لا الہ الا اللہ

ازل کے دن سے ابد تک حُسین نے دی ہے
وفا کی نُوری اذاں، لا الہ الا اللہ

مرے سخی ہیں عنایات بے نظیر تری
ملے مجھے بھی اماں، لا الہ الا اللہ

☆☆☆

www.mirrat.com
عالمی معیار کی
ویب سائٹ
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(اقبال)
ماہنامہ
مراۃ العارفین
انٹرنیشنل
لاہور
ملکی اور بین الاقوامی حالات، پاکستان اور عالم اسلام کو درپیش چیلنجز، تصوف، ادب،
معاشرت اور ثقافت جیسے دیگر اہم موضوعات پہ علمی و تحقیقی مضامین
مصنوعی ذہانت اور مشرقِ وسطیٰ کی کشیدہ صورتحال
ڈاکٹر لئیق احمد
مراۃ العارفین انٹرنیشنل اردو کا ماہانہ تحقیقی مجلہ ہے۔
مذکورہ ماہنامہ کا نام سیدالشہداء نواسہ رسول حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ)
کی ایک عظیم تصنیف مراۃ العارفین پر رکھا گیا ہے۔
www.mirrat.com
تازہ ترین اور گزشتہ میگزین
کے مطالعہ کیلئے وزٹ کریں

YouTube
CHANNEL
صاحبزادہ سلطان احمد علی
(چیئر مین مسلم انسٹیٹیوٹ)
کے علمی، فکری و تحقیقی لیکچرز سے مستفید ہونے کے لیے
ابھی سبسکرائب کریں۔
youtube.com/@sultanahmedali
عصرِ حاضر کے مسائل
فلسفہ
عالمی امور
روحانیت
تاریخ و ثقافت
سیرت النبی ﷺ
قرآن کی روشنی میں
تمہیدی گفتگو
29 videos
رومی کا ایسا
ورلڈ ویو
جو زندگی بدل دے
صاحبزادہ سلطان احمد علی
توبہ توبہ توبہ
چشم کشا حقائق لازمی سنیں
مزارِ اقبال میں
ایک پوشیدہ پیغام
صاحبزادہ سلطان احمد علی
Hadrat
Sultan Bahoo
and
Mevlana Rumi
با مقصد زندگی بسر
کرنے کے تقاضے
غیر نبی کو الہام
فیصلہ ایمان سے
دلیل قرآن سے
صاحبزادہ سلطان احمد علی
GENOCIDE AND MASS ATROCITIES
AGAINST MUSLIMS
EYE OPENING FACTS
منطق الطیر
کی دلچسپ
حکایات